عشاق کے قافلے

4

کامن سینس

Commonsense

تھامس پین

شاہ محمد مری

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
ور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فیضؔ

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

عبداللطیف بھٹائی

(سیاسی سوانح)

مصنف: شاہ محمد مری

اشاعت: 2014ء

قیمت: 200/- روپے

زیراہتمام: مہردر

انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن

پی او بکس 26، کوئٹہ، بلوچستان

ڈسٹری بیوٹرز:

سیلز اینڈ سروسز

کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ

فون: +92-81-2843229

فیکس: +92-81-2837672

اسٹاکسٹ:

یونیورسٹی بک پوائنٹ

شاپ نمبر 10، کمپلیکس

بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

فون: 0345 8813838

انتساب

اُمید کے درخت کو

پانی دیتے رہنے والوں کے نام

جہاں آزادی ہے، وہی میرا وطن ہے!

فرینکلن

جہاں آزادی نہیں ہے، وہی میرا وطن ہے!

ٹام پین

ترتیب

پیش لفظ 9

بے نام ابتدا 18

پائے فقیراں لنگ نیست 22

کامن سینس

25

___ حکومت پیدا کیسے ہوئی...... 26

___ بادشاہت اور موروثی جانشینی 31

___ امریکہ کی موجودہ صورتِ حال 36

___ امریکہ کی موجودہ صلاحیت پر 48

___ کامن سینس کا ضمیمہ 54

کامن سنس کی مقبولیت 61

___ امریکہ کا اعلانِ آزادی 64

امریکی بحران 70

پین، انگلینڈ میں 84

انسان کے حقوق	88
___ انسان اور شہریوں کے حقوق کا اعلان نامہ	97
پین فرانس میں......ریپبلکن فرانس میں	109
دلیل کا زمانہ	113
لگزمبرگ جیل	123
زرعی انصاف	128
وحدت کالونی کا آخری سٹاپ	132

پیش لفظ

تاریخ کو جج ٹھہرانے والے احباب، بالخصوص نوجوانوں کو بتانے کی ضرورت ہے کہ تاریخ ہمیشہ انصاف ہی نہیں کرتی۔ اس سے کبھی کبھی برباد کرڈالنے والی بے انصافیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص کمزور فرد، گروہ، طبقات اور اقوام کے ساتھ اس نے بہت کم خیر کا کام کیا۔ بلاشبہ محترم بنادینا، نظرانداز کردینا، یا حقیر قرار دینا تاریخ ہی کے فرائض ہیں۔ اور اس کے لیے اُس کے پاس معیارات اور پیرا میٹرز بھی موجود ہیں۔ مگر، پھر بھی بس کچھ ہوجاتا ہے کہ جب کبھی بات زیردست کی آتی ہے تو تاریخ کی آنکھ میں ککرے پڑ جاتے ہیں.......... بڑے بڑے اور برباد کر ڈالنے والے ککرے۔ اور، ہم جیسے للّی پُٹ لوگ تاریخ جیسی بڑی قوت کی ایسی کوتاہیوں کی ٹیڑھ کبھی نہیں نکال پاتے کہ بالادست کی بات بہت دیرپا رہتی ہے۔ حاکم، تاریخ کے اپنے بیانیے کو دیرپا رکھنے کے ہزار وسیلے ایجاد کرتا رہتا ہے۔

جب آپ ٹام پین کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں پڑھیں تو آپ کو تاریخ کی اِس فاش ناانصافی کا بھرپور احساس ہوگا۔ ہمہ وقت دشمن کے مورچوں کے اندر چوکڑیاں بھرتے اس لڑاکو سے متعلق تاریخ نے تقریباً مکمل نظراندازی، حتمی خموشی، اور مطلق بے پرواہی روا رکھی.......... ایک لامتناہی اندھی ناانصافی۔ آپ بس تلملا کر رہ جاتے ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اور اگر کہیں بھی تو

کس سے؟ ول ڈیورانٹ سے؟ برٹرینڈ رسل سے؟ کارل مارکس سے......؟نہیں ناں؟ ۔لہٰذا آئیے ہم اپنے حصے اور جُثے کا انصاف کر ڈالتے ہیں۔تاریخ بڑا تھیریم ہے،اس کا کفارہ کوئی بڑا شخص ہی ادا کرے!۔

ٹام پین محض آزادی وانصاف کے مورچے کا جری اور جاں باز سپاہی نہ تھا،وہ تو انتہائی تاثیر رکھنے والی تحریر کا مالک بھی تھا۔اس نے بہت لکھا۔غلاموں غریبوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔

امریکہ کی جنگِ آزادی کو اس کے سپلائی کردہ آکسیجن کے صرف ایک کتابچے کامن سینس کو ہی لے لیجیے۔اُس کے بارے میں جان ایڈمز نے لکھا تھا کہ:''کامن سینس کے مصنف کے قلم کے بغیر جارج واشنگٹن کی تلوار بس یونہی ہوا میں لہراتی رہتی۔''

ٹام پین کے نام اور کارناموں سے ہماری واقفیت بس واجبی سی تھی۔ اس کی تحریریں پاکستان میں ملتی نہ تھیں۔(وہ تو خیر ابھی تک میسر نہیں ہیں)۔اس کا مجموعہِ تصانیف میں نے امریکہ کے Book Of The Month Club سے منگوالیا۔ایک مجلد خوبصورت موٹی کتاب جو امریکہ میں چھپائی کی صنعت کی ترقی یافتگی کا ثبوت تھی۔ میں نے یہ کتاب بہت انہماک سے پڑھنی شروع کی ۔تین سو برس قبل کی انگریزی مشکل ونامانوس ہونے کے باوجود ڈکشنریوں اور انسائیکلو پیڈیاؤں کی مدد کے بغیر ہی پڑھ ڈالی۔

مجھے اس کی کتاب نے بہت متاثر کیا تھا۔(اُس زمانے کے لحاظ سے)عام سے سادہ الفاظ اور عوامی بولی میں معاصر سیاسی اور فلسفیانہ معاملات کو بیان کیا گیا۔ پین چونکہ عام محنت گزار آدمی تھا،اس لیے اس نے عام عوامی زبان ہی استعمال کی۔اور چونکہ مقصد اپنے جیسوں کو قائل کرنا تھا،اس لیے وہ شعوری طور پر انھی کی سطح تک آکر اُن سے بات کرتا ہے۔عام سی دلیلیں،مقبول عام محاورے اور ضرب الامثال۔وہ کبھی خود ہی سوال اٹھا کر خود ہی جواب دیتا ہے،کبھی کسی رواں مباحثے کا حصہ بنتا ہے۔وہ برطانوی سامراج کے ہاتھوں غلام کردہ امریکہ کی آزادی سے متعلق ہر نظریاتی معاملے سے نمٹتا ہے۔جنگی حکمتِ عملی کے بارے میں امور کو چھیڑتا ہے۔وہ مخالفین پہ تنقید یں کرتا ہے،حامیوں کے حوصلے بڑھاتا ہے۔پمفلٹ نما تحریریں،جو وہ ضرورت کے وقت لکھتا اور

چھاپتا رہتا ہے۔

ٹام پین کے سوانح نگار ہارورڈ فاسٹ کے بقول،''پین کو لفظوں کی تلاش کی ضرورت نہ تھی۔وہ اُس پر آسانی سے اترتے تھے،اور ہر لفظ ایک تلخ یادداشت ہوتا تھا۔''

ٹام پین نے سب سے پہلے دلیلوں سے بھرا ہوا،آزادی پسند اور عالمانہ پمفلٹ کامن سینس (عقلِ سلیم) لکھا۔اُس نے اِس پر مصنف کے بطور اپنا نام نہیں لکھا بلکہ مصنف کی جگہ پر لکھا: ''ایک انگلینڈ والے کا تحریر کردہ''۔

یہاں،ٹام پین نے جنگِ آزادی کے لیڈروں کے اندر موجود باہمی چپقلش کو بہت محسوس کیا اور اسے بہت منفی جانا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہاں ابھی تک،عوام کے اندر اس بات پہ سخت تذبذب موجود تھا کہ آیا برطانوی سامراج کے ساتھ جنگ کی جائے یا اس کے ساتھ مصالحت کے امکانات تلاش کیے جائیں۔ پین نے ڈھلمل کی اس ذہنیت کو پسند نہ کیا۔ دراصل اس نے ان رجحانات کے خلاف پمفلٹ لکھنا شروع کیا۔ اُس نے جنگِ آزادی کو وسوسوں سے پاک کرنے، سپاہیوں مجاہدوں کے ذہن صاف کرنے اور اِن فکری کنفیوژنوں اور متذبذب ارادوں کی جھاڑ پھونک اور صفائی ستھرائی کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے امریکی عوام کو واضح منزل اور ٹھیک راستہ دکھانے کا عزم کیا۔

چنانچہ انقلاب کی شروعات کے زمانے میں،دس جنوری 1776 کو واضح،طاقت ور،اور بائبل کی سی شاعری والی زبان میں اس نے برطانیہ سے امریکہ کی آزادی کا منشور لکھ ڈالا۔یوں،یہ رہتی دنیا تک زندہ رہنے والا کتابچہ بنا۔اس نے اپنی خوبصورت تحریر میں ایک ماسٹر پیس جملہ یہ لکھا کہ،''برطانوی حاکمیت کے زیرِ تسلط امریکہ کیسے خود کو آزاد کہہ سکتا ہے، جب اس کی قانون سازی تین ہزار میل دور بیٹھے ایک شخص (بادشاہ) کی مرضی پر منحصر رہتی ہے،جس کے مفادات ہمارے مفادات سے الٹ ہیں ۔ اور جو ایک واحد لفظ 'نہیں' کہہ کر ہمارے ہر اچھے قانون کو ملیا میٹ کر سکتا ہے''۔

آزادی کی فوج میں شامل ہونا اور برطانیہ سے آزادی حاصل کرنا اس پمفلٹ کے اہم

ترین نکات تھے۔ یہ غلام امریکیوں کے لیے گویا صور کی آواز تھی کہ انہیں اپنی آزادی کے لیے لڑنا چاہیے، نہ سمجھوتا کرنا چاہیے، نہ تذبذب میں پڑنا چاہیے۔

ٹام پین اِس کتابچے میں ادبی شاہکار ''بائبل'' کی کئی آیتوں کو شامل کرتا ہے۔ عام سی باتیں، انجیل میں لپٹی ہوئی باتیں۔ وہ بار بار انجیل کے حوالے لاتا ہے۔ اتنے زیادہ حوالے، کہ لگتا ہے سٹینرن ٹام پین نہیں بول رہا ہو بلکہ چوغوں منکوں میں ملبوس ایک پوپ، وعظ کر رہا ہو۔ اُس نے گویا انجیل کا ایک دوسرا تلخیصی ایڈیشن لکھ ڈالا۔

میرے لیے یہ بہت دلچسپ بات تھی کہ بائبل میں بادشاہت کے خلاف اس قدر زیادہ اور زبردست مواد موجود ہے۔ پین نے ان شاہ دشمن فقروں، آیتوں، اور شعروں کو خوب استعمال کیا اور بادشاہت سے وفاداری کے ہر رویے کا تختہ اُلٹ دیا۔

وہ ماضی میں بادشاہوں کے پیدا کردہ کئی مسائل کا ذکر کرتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انگلینڈ میں بادشاہ کو سوائے جنگ کرنے کے، اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ صرف اس کام کے لیے اسے اتنی آسائشیں اور اختیارات حاصل ہیں!۔ بادشاہت تو بادشاہت، ٹام پین آئینی بادشاہت سے بھی، بہت نفرت کرتا ہے اور اس کی مخالفت کرتا ہے۔

اس پمفلٹ میں ٹام کو بادشاہی نظام کے خلاف جتنے بھی برے (مگر مہذب)، الفاظ یاد ہیں وہ سب کے سب استعمال کرتا ہے۔ وہ بادشاہت کو وحشت کہتا ہے۔ وہ اُسے آزادیوں کا دیرینہ دشمن کہتا ہے، طاقت کی آمریت کا پیاسا لکھتا ہے۔ اس نے بتایا کہ بادشاہ کا تو ایک ہی منشا ہوتا ہے: ''قانون وہی جو میں چاہوں گا''۔ بادشاہ قانون ہوتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ قانون ، بادشاہ ہو۔

ٹام پین جمہوریت اور انسانی بھائی چارہ چاہتا تھا۔ وہ پوری دنیا کی ایک فیڈریشن بنانے کے حق میں تھا۔ وہ اپنے قاری کو مثالیں دے دے کر اپنی بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہمیں ایک ایسی آبادی دکھاتا ہے جن پر کوئی حکومت موجود نہیں ہے۔ اور وہ الگ الگ رہنے کے بجائے اکٹھے رہنے میں آسانیاں دیکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ایک سماج بناتے ہیں۔ جوں جوں سماج بڑھوتری پاتا جاتا ہے،

سماجی مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ جمع ہو کر ان مسائل کے حل کے لیے قوانین بناتے جاتے ہیں۔ سماج کی بڑھوتری جاری رہتی ہے اور ایک مقام ایسا آتا ہے کہ ان قوانین کے اطلاق کے لیے ایک حکومت ضروری ہو جاتی ہے۔ ایک بہت بڑی اور بکھری آبادی روزانہ تو اکٹھے نہیں ہو سکتی!۔ اس لیے اُنہوں نے انتخابات منعقد کرنے شروع کر دیے۔ ایک ایسا طریقہ جو حکومت اور عوام کے بیچ توازن برقرار رکھتا ہے۔ ہاں، وہ یہ بات ضرور بتاتا ہے کہ تہذیب جتنی زیادہ پختہ ہوگی، حکومت کے لیے اتنی ہی کم گنجائش رہ جائے گی۔ اس بحث میں وہ برطانیہ کا آئین بھی چھیڑتا ہے جس میں وہ دو برائیاں دیکھتا ہے۔ ایک بادشاہت اور دوسری وڈیرہ گیری۔ یہ دونوں موروثی ادارے ہیں اور یہ دونوں کچھ کام نہیں کرتے۔ یہ شخص موروثی حکمرانی کا تو سمجھو بدترین دشمن ہے۔

ٹام پین ایک امریکی 'میگنا کارٹا' کی وکالت کرتا ہے جو ''سارے انسانوں کے لیے آزادی'' کا حق دے۔ وہ عوامی مقبول رائے یعنی الیکشن پر مشتمل ایک جدید ریپبلک کی وکالت کرتا ہے جس کی ایک اسمبلی یا کانگریس ہو۔ یہی کانگریس الیکشن کے ذریعے ایک صدر منتخب کرے۔ اُس کی یہ تجویز بھی تھی کہ ہر اہم فیصلے کے لیے کانگریس کی دوتہائی کا متفق ہونا لازمی ہو۔

تھامس پین برطانیہ سے امریکہ کی آزادی کو سب سے ارفع بات گردانتا ہے۔ ٹام پین اتنے چھوٹے انگلینڈ کی طرف سے اس قدر وسیع امریکہ پر قبضے کا مذاق اڑاتا ہے۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنا حصہ قرار دے کر اسے غیر ضروری طور پر یورپی جنگوں میں گھسیٹ لے جائے گا۔ پھر کہاں برطانیہ، کہاں امریکہ۔ ان دونوں علاقوں کی جغرافیائی دوری امریکہ میں حکومت کرنے کو بہت مشکل بنا لیتی ہے۔

ایک آزادی، اور دوسرا اس کے حصول کے لیے جدوجہد، اور تیسرا اُس جدوجہد میں ثابت قدمی اور چوتھا بادشاہت سے شدید ترین نفرت .... یہ ہے اس کتابچے کے مندرجات کا نچوڑ۔ یہ کتابچہ عام زبان میں ہے، عام سے دلائل ہیں............ کوئی بناوٹ نہیں، موٹے الفاظ نہیں، بھاری فقرے نہیں۔ ایک امید، ایک تجویز، ایک راہ، اور ایک منزل۔ اس نے عوام الناس کے کاز کو ایک اعزاز قرار دیا۔ وہ ہر طبقہ، ہر جنس اور ہر علاقے کے عام انسان سے براہِ راست مخاطب

تھا۔ بلاشبہ یہ ایک آتشیں کتابچہ ہے۔ ایسی خوبصورت طرز کہ آدمی پڑھ کر وہیں فیصلہ لے لے۔ فوری فیصلہ۔ ایک ایک فقرے کے گھونگھٹ سے بھرپور دانش، درشن دیتی جاتی ہے۔

کامن سینس نامی کتاب کی بڑی خاصیت یہ تھی کہ اس نے عوام کو بتایا کہ بادشاہت کے بغیر بھی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اس نے یہ بات بھی منوالی کہ ووٹ کے حق کے لیے صاحبِ جائیداد ہونے کی شرط غلط ہے۔...... اُس نے یہ کتاب بغیر کسی بڑی اصطلاحات کے استعمال کے لکھی۔ اس نے اپنی سیاسی تحریر میں کوئی پیچیدہ الفاظ شامل نہ کیے بلکہ ایسا اسلوب اور ایسی زبان استعمال کی جو عام آدمی کی تھی۔ اس سے اُس نے اپنے ارفع سیاسی خیالات کو عام آدمی کے دماغ کے اندر پہنچادیا۔ 'اُس' کے نظریات 'اُن' کے نظریات بن گئے۔ اُس نے عام آدمی کی سیاسی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا بلکہ اس نے ڈائریکٹ اور سادہ انداز میں عام آدمی کو مخاطب کیا۔ اس نے سیاسی نظریات کو گلی کے عام انسان کے لیے قابلِ فہم بنایا۔ چنانچہ اس پمفلٹ سے عام امریکی بھی سیاسی بحث میں شامل ہوا اور بالکل ایک نئی سیاسی بولی ایجاد ہوگئی۔ اور جو لوگ اَن پڑھ تھے، وہ بھی اس سیاسی بحث میں شامل ہوگئے اس لیے کہ **کامن سینس** عام اجتماع کی جگہوں میں پڑھی جاتی تھی۔ یہ ہر علاقے کے ہر گھر کے چولھے کے گرد بحث کا موضوع تھی۔ اور پھر غلامی سے آزادی کی بات تو ہر ایماندار انسان کو اچھی لگتی ہے۔ آزادی تو سب سے فوری بات ہوتی ہے، آزادی تو سب سے دیرپا بات ہوتی ہے۔ پین نے آزادی کی بات کی تھی۔ آزادی جادوئی قوت رکھتی ہے۔ اس جادو نے امریکی غلام معاشرے کو مکمل گرفت میں لے لیا۔

میں نے اس کتابچے کے ساتھ ساتھ ٹام پین کے دوسرے کتابچوں کے ضروری حصوں کا ترجمہ کیا۔ تین سو سال قبل لکھے اس کے کتابچوں میں آج کے لحاظ سے بے شمار غیر ضروری، غیر متعلقہ اور سمجھ نہ آنے والی باتیں موجود ہیں۔ وہ حصے میں نے ترجمے میں شامل نہیں کیے۔ جو باتیں آج کے قاری کو، بالخصوص ہمارے علاقے کے قاری کو سمجھ میں آسکیں، وہی میں نے اس ترجمہ میں شامل کی ہیں۔ میں نے اس میں امریکہ کے ساتھ لفظ 'غلام' شامل کر دیا تاکہ قاری کو ہر وقت یہ اندازہ ہو کہ یہاں آج کے سپر پاور امریکہ کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ یہ اُس امریکہ کا ذکر ہے جب وہ خود ایک غلام

ملک تھا، اور برطانیہ اُس پر حکومت کرتا تھا۔ اور وہاں برطانیہ کے خلاف تحریکِ آزادی چل رہی تھی۔

آپ بھی میری طرح حیران ہوں گے کہ اُس شخص اور اس کی تحریروں کو تین سو سال ہو چکے ہیں مگر انسان ہے کہ ابھی تک اُنہی معاملات سے دوچار چلا آ رہا ہے۔ اور اُس کی ساری صف بندیاں اُنہی معاملات کے حق یا مخالفت میں آج بھی موجود ہیں۔ صرف نام اور کیریکٹر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اُس وقت امریکہ غلام تھا اور برطانیہ اس پر حکمران تھا۔ آج امریکہ حکمران ہے اور پوری دنیا اس کی غلام ہے۔ آزادی اُس وقت بھی انسان کی سب سے بڑی تڑپ تھی، آزادی آج بھی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ پھر، 'اس آزادی سے کیا سلوک کیا جائے' یہ سوال اُس وقت بھی موجود تھا آج بھی ہے: مکمل آزادی ہو؟، خودمختاری ہو؟، یا پھر محض غلام و آقا کے درمیان تعلق میں کچھ اصلاح ہو؟۔ یہ تین رویے ہیں انسان کے آزادی کے ساتھ۔ ٹام پین کے اس مشہور زمانہ پمفلٹ میں، آپ صرف امریکہ اور برطانیہ کے الفاظ ہٹا کر بلوچستان لکھ دیں تو آپ کو لگے گا جیسے یوسف عزیز بول رہا ہو، جیسے شورش بابو بات کر رہا ہو، جیسے عبداللہ جان بول رہا ہو۔ میں نے اُسی عبداللہ جان کا ترجمہ کیا ہے جس نے تین سو برس قبل مجھ جیسوں کے لیے یہ تحریریں لکھ چھوڑی تھیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ پین نہ تو کسی لا کالج کے کانووکیشن میں چوغہ یافتہ تھا اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل فلاسفر تھا۔ وہ میٹرک تو کیا پرائمری پاس بھی نہ تھا۔ چونکہ امریکی عوام پین کے آبائی ملک برطانیہ کے خلاف اپنی جنگِ آزادی میں مصروف تھے، اور پین اُن کا حامی و ساتھی تھا، اس لیے ٹام پین نے سب سے پہلے تو خود کو برطانوی شہری ہونے کی نفسیاتی کیفیت سے مکمل آزاد کرلیا۔ اُس نے خود کو حتمی طور پر ایک امریکی میں ڈھال دیا۔...... اور یہ کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ دوسروں میں خود کو ایڈجسٹ کرنا اور دوسروں کا اُسے قبول کرنا تو لمحہ لمحہ کی ریاضت کا کام ہوتا ہے۔ گھڑی در گھڑی جسم و روح کا ایک ایک خلیہ ڈھالنا ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسا ٹام پین نے کیا (جو برطانیہ کا تھا مگر اس نے خود کو امریکہ سے نفع نقصان میں پیوست کرلیا)، یہی 'ہڈ پروشی' ویت نام کے ہوچی منہ نے کی تھی (وہ ویت نام کی آزادی کے لیے فرانس سے لڑ بھی رہا تھا اور اُسی فرانس کے مزدوروں کسانوں اور عورتوں کی سیاسی پارٹی یعنی فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بھی تھا)۔ تاریخ میں

تیسرا ایسا بڑا نام چے گویرا کا ہے جو ارجنٹینا کا باشندہ تھا مگر کیوبا کے انقلاب میں لڑا، کامیاب ہوا، عوامی حکمرانی کی خدمت کی۔ اسی طرح محمود درویش فلسطین کا قومی شاعر تھا اور اسرائیل سے اپنی قومی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا مگر شامل تھا اسی اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی میں۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان ابھی بحیثیتِ مجموعی اس قدر بالغ نہیں ہوا کہ اس ایجاب وقبول کو اپنی نفسیات میں بھی بہ خوشی شامل کر دے۔ انسانی سماج ابھی تک بڑے انسانوں کی بڑائی جتنی جگہ خود میں پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس لیے جو جو مصیبتیں ہو چی منہ اور چی گویرا نے عبور کیں، وہی مصیبتیں دگنی تگنی مقدار میں ٹام پین نے جھیلیں۔

بلوچستان میں، میرے پیش رو لکھاری بعض معاملات میں اس قدر اصراف کرتے رہے ہیں کہ میرے لیے جائز اخراجات کے لیے بھی کچھ نہیں بچتا۔ آپ جب سٹیزن ٹام پین کے بارے میں یہ مضمون پڑھ کر ختم کریں گے تو بلوچستان میں ایسی کئی شخصیات گزری ہیں، جنہیں آپ ٹام پین جیسا قرار دے سکیں گے۔ مگر ایسا آپ خود کر لیں، اپنے رِسک پہ۔ میں کچھ نہ لکھوں گا۔ اس لیے کہ یہاں حوصلہ افزائی کے نام پہ، ایسے ایسے بے جوڑ موازنے کیے جا چکے ہیں کہ میرے لیے ایسا کرنے کی مزید گنجائش نہیں ہے۔ کسی کو چیخوف بنایا گیا تو کسی کو شیکسپیئر، کوئی ٹالسٹائی ٹھہرا تو کسی کو مارکوئیز کا ہم پلہ قرار دیا گیا............ویسے بھی زمان ومکاں میں جب بہت فرق ہو تو دو اشخاص کا موازنہ کرنا ہی احمقی ہے۔

اس شخص کو کوساڑھے تین سو سال گزر گئے لیکن لگتا ہے دنیا کا وہ فارمولا ابھی تک قائم ہے جسے بدلنے کو ٹام پین نے پوری زندگی اور اُس کی مسرتیں قربان کر دیں۔ کس قدر ڈھیٹ ہے طبقاتی نظام۔ اس آدم خور نظام نے اب تک کروڑوں انسان اپنے دوام کی خوراک کے لیے ہڑپ کر لیے ہیں۔ مگر انسان ہیں کہ اس اژدھا کو مار ڈالنے کے لیے قافلہ در قافلہ نکلتے مرتے اور دوبارجنمتے ہیں۔ عشاق کے ان قافلوں کو یاد رکھنا چاہیے، ایمان کی سلامتی میں بہت مدد ملتی ہے۔

تحریر وتحقیق وتالیف میں دو چار مددگار دوستوں کی موجودگی عیاشی نہیں، ضرورت ہوتی

ہے۔ اور اگر آپ بلوچ ہیں تو پھر ایک آدھ دوست کا میسر رہنا اور بھی ضروری ہوتا ہے جو آپ کے مرتعش فقروں کو توانائی بخشیں یا آپ کے جذباتی اظہار کو ذرا سی لگام دیں۔ میرے لیے تو یہ اور بھی لازم ٹھہرا کہ میری اردو کے اندر، بغیر کسی کشٹ کے، بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھتے دیکھتے مذکر، مونث بن جاتا ہے اور مونث مذکر۔

شکر ہے بلاتکلف رجوع کرنے کو میرے پاس جاوید اختر، عابد میر، وحید زہیر اور علی کمیل قزلباش جیسے احباب ہمہ وقت ایک فون کال کے فاصلے پر موجود رہے۔

شاہ محمد مری

ماوند 29 جنوری 2014

بے نام ابتدا

تھامس پین (ٹام پین) اٹھارویں صدی کا ایک عام آدمی تھا۔ وہ بنیادی طور پر تو ایک انگریز تھا مگر بعد میں ایک ایسی جدوجہد میں کود پڑا جس نے اسے ایک گروہ، ایک قوم، ایک جغرافیائی لکیر اور رنگ وعقیدہ ونسل سے بہت بلند کر دیا۔ وہ کائناتی وجود اور ہستی کا حصہ بن گیا۔ حصوں ٹکڑوں کی بجائے وہ کُل کا حصہ بنا۔ وہ ''یونیورس'' کا باشندہ مشہور ہو گیا۔

ٹام پین 29 جنوری 1737 میں پیدا ہوا، برطانوی شاہی نظام میں جکڑے ہوئے تھیٹ فورڈ نامی تجارتی قصبے میں، غریب ماں باپ کے ہاں۔ اس کے باپ کا نام جوزف پین تھا۔ یہ لوگ مسیحی مذہب میں کوئیکر نامی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئیکرز نامی فرقہ سترہویں صدی کے وسط میں انگلینڈ میں قائم ہوا۔ اس فرقے کا لفظی مطلب ہے؛ ''احباب''۔ اس فرقہ کی خاص باتوں میں جنگ میں حصہ لینے سے انکار، سادہ لباس پہننا، حلف اور قسمیں لینے سے اجتناب، اور شراب کی مخالفت شامل تھے۔ ان کے ہاں پادری یا ملاّ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حضرت یسوع مسیح کی طرح سیدھا

عوام کی طرف جایا جائے۔

پین کی ماں کا نام فرانسس کوک پین تھا۔ ٹام پین کی تعلیم واجبی سی تھی۔ وہ محض پڑھ، لکھ سکتا تھا۔ سادہ، سچا، خلوص سے بھرا عام گرتا پڑتا بڑا ہوتا بچہ جس کی روحانی پاکیزگی لاثانی تھی۔ کوئیکر ہونے کی وجہ سے اسے اچھی اخلاقی تعلیم ملی۔ اس کا ذہنی جھکاؤ بچپن ہی سے سائنس کی جانب تھا۔ اس میں شاعری کی کچھ صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اس نے اس کی کوئی خاص حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ماں باپ نے تھامس پین نام رکھا۔ مگر بڑا ہو کر اُس نے ٹام پین کے نام سے شہرت پائی تھی۔ اُس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ امریکہ میں محبوب ترین ومقبول ترین مصنف بن گیا۔ اور چونکہ اُس کے مشہورِ عالم کتابچے کا نام ''کامن سینس'' تھا، اس لیے وہ خود بھی عام وخاص میں ''کامن سینس'' کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر وہ کوئی ناول نگار، شاعر یا ادیب نہ تھا۔ وہ تو تاریخ کا عظیم ترین سیاسی پروپیگنڈچی تھا، ایک پمفلٹ نویس۔ ایسا پمفلٹ نویس جس کا ایک ایک پمفلٹ یا کتابچہ لاکھوں کی تعداد میں فوری طور پر بک جاتا۔ وہ ایک عنوان سے پمفلٹ کی کئی جلدیں لکھتا تھا، بس ان کے نام کے آگے نمبر ایک، نمبر دو لکھتا جاتا............ اس کی پمفلٹ نما تصانیف کے نام یوں ہیں: کامن سینس، امریکی بحران، (یہ دونوں تصانیف امریکی جنگِ آزادی کے حق میں لکھی گئیں)، حقوقِ انسان، (انقلابِ فرانس کے حق میں)، عہدِ خرد افروزی (سماج میں مذہب کے مقام کے بارے میں)، اور زرعی انصاف۔

اُس کے کامن سینس اور "بحران" نے تو بالخصوص عوام الناس کو جھنجھوڑ ڈالا اور انہیں بلند آواز سے آزادی کا نعرہ لگانے کی ہمت عطا کر دی۔ صرف انہی دو کتابچوں نے ٹام پین کو نسلِ انساں کی آزادی اور دیرپا بہبود کے گرم جوش دوستوں کی صف میں کھڑا کر دیا............ مگر، حیرت کی بات یہ ہے کہ ٹام پین نے جتنا زیادہ لکھا تھا، خود اُس کے بارے میں بھی اتنا ہی کم لکھا گیا ہے۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ یہ شخص تھا تو برطانیہ کا رہنے والا مگر آزادی کی جنگ جا کر امریکہ والوں کی لڑا اور وہ بھی اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف، جنہوں نے امریکہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔

برطانیہ خود بھی کب آزاد تھا! بادشاہی نظام والا ملک بھلا آزاد ہوتا ہے؟۔ برطانیہ اتنا بڑا ملک ہوا کرتا تھا کہ اُس پہ سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ مگر اندازہ کریں اس سارے وسیع و عریض ملک میں بس، ایک ہی فردِ واحد سب کچھ تھا...... ظلِ الٰہی، آنحضرت، عزت مآب، جلالت مآب، شاہِ جہاں اور بادشاہ سلامت...... عقل، علم، حلم، شاہ، شہنشاہ، سب کچھ وہی تھا۔ باقی تو جیسے وہاں کوئی بندہ بشر رہتا ہی نہ ہو؛ بس رعایا، رعیت جیسے کیڑے مکوڑے ہوں۔ بادشاہی نظام سے زیادہ توہین آمیز نظام انسان نے کبھی نہیں دیکھا۔ اِس نظام میں تو صرف دو آدمیوں کی عیش ہوتی ہے: ایک مُلّا (یا پادری) اور دوسرا جاگیردار۔ باقی آبادی تو بس طبعی اور روحانی طور پر جولان لگے مزدوروں پر مشتمل ہوتی ہے، جن کے کوئی حق حقوق نہیں ہوتے۔

ٹام پین کا غریب باپ عورتوں کے بریزیئر بنا کر فروخت کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ ٹام پین بھی تیرہ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ بریزیئر بنانے لگا۔ غریب والد ظاہر ہے تیز مزاج کا شخص تھا۔ چنانچہ ٹام والد کی سختیاں جھڑکیاں سہتا رہا۔

پھر وہ ایکسائز میں بھرتی ہوگیا۔ بہت ہی محدود آمدنی میں سے بھی وہ کتابیں خریدنا نہ بھولتا تھا۔ 1772 کے گرما میں اس نے 21 صفحات پر مشتمل اپنی اولین سیاسی تحریر لکھی۔ جس میں اس نے تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کیا جس کی سزا کے بطور اسے ایکسائز کی نوکری سے برطرف کیا گیا۔

اپنے ملک میں اسے آزادی آبادی کی کوئی امید نظر نہ آئی۔ بھوک تھی، روحانی سکون اور شخصی بڑھوتری کے تمام امکانات صفر تھے۔ لوگ چرچ اور بادشاہ کی دیکھی اَن دیکھی زنجیروں سے چمٹے ہوئے تھے۔ خیر کی امید تو عوام سے ہونی تھی مگر عوام میں اُس وقت تک کوئی تحریک کوئی تنظیم موجود نہ تھی۔ یہ شخص تو سچ کا متلاشی تھا۔ سچ کی حاکمیت چاہتا تھا۔ لہٰذا محرومیوں اور ناکامیوں کے تسلسل میں، انتہائی غربت، مفلسی اور مشقت کے اندر پک پک کر بے ملکیت اور بے روزگار تھامس پین نے برطانوی نو آبادی امریکہ جانے کی ٹھان لی جہاں روزگار بہت وافر تھی۔ چنانچہ وہ بنجمن فرینکلن نامی انگریز سے ایک تعارفی خط لینے اس کے پاس پہنچا۔

فرینکلن غلام امریکہ میں قابض برطانیہ کا افسر تھا۔ جہاندیدہ، مددگار اور مہذب شخص۔ وہی فرینکلن جس نے اپنی قبر پر کتبہ کے لیے یہ تحریر لکھ چھوڑی تھی: ''پرنٹر، بنجمن فرینکلن کا جسم، ایک پرانی کتاب کی جلد کی طرح، کہ اس کے مندرجات پھٹے ہوئے ہیں، یہ اپنی کتابت و حروف سے محروم یہاں لیٹا ہے کیڑوں کی خوراک کے لیے۔ مگر تصنیف کبھی ضایع نہ ہوگی، اس لیے کہ یہ ایک نئے اور زیادہ شاندار ایڈیشن میں نمودار ہوگی۔''

پائے فقیراں لنگ نیست

پین اُس کا سفارشی خط لے کر برطانیہ چھوڑ گیا اور برطانوی نو آبادی امریکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ امریکہ نئی دنیا جو تھی۔

وہ 30 نومبر 1774 کو امریکی شہر فلیڈیلفیا پہنچا۔ ٹرانس اٹلانٹک سمندری سفر نے اس کے پانچ ہم سفروں کو ٹائیفائڈ کے ہاتھوں مار دیا۔ دکھوں کا عادی ٹام پین بھی بیماری میں ادھ موا ہوا، مگر مرگ سے ذرا قبل وہاں پہنچا۔ بنجمن فرینکلن کے ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا۔ ڈیڑھ ماہ بعد کہیں جا کر اُس کی صحت بحال ہوئی۔

روزگار کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے وہ بالآخر جنوری 1775 کو پنسلوانیا میگزین کے لیے مضامین لکھنے لگا۔ وہ اس کے ایڈیٹر کا اسسٹنٹ بنا۔ اس پر یہ دلچسپ حقیقت واضح ہوئی کہ خود برطانیہ میں انصاف نہ تھا تو اُس کی نو آبادی میں انصاف کہاں سے آتا؟۔ امریکہ جا کر اُس نے غلامی کی بے پردگی کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس نے سیاہ فام نیگرو کی غلامی دیکھی، عورت کی ابتر حالت کا مشاہدہ کیا۔ ایک زبردست بات اُس کے ساتھ یہ ہوئی کہ اُس نے 'سچ' کی طرف داری شروع کر دی۔ جہاں جہاں سچ ہوتا، وہاں وہاں تھامس پین ہوتا۔ اور جہاں سچ میں ملاوٹ نظر آتی، تھامس وہاں

سے دور بھاگ جاتا۔ لہٰذا وہ دربار سے دور تھا، عدالت سے دور تھا، پادری سے دور تھا، اُس کے چرچ سے دور تھا۔ اور آپ اِن جگہوں سے جتنا دور ہوں گے، عوام الناس سے اُسی قدر نزدیک ہوں گے ....اور عوام تو اس کا اپنا طبقہ بھی تھا۔ آسانی سے گھل مل جانے والے عوام الناس سے تھامس پین کی وابستگی زندگی بھر رہی۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی سکول میں نہ جا سکا تھا، اس نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ عام آدمی، عام عوامی زبان اور عام عوامی نشست و برخاست۔ لہٰذا اُس نے کبھی بھی الفاظ کی محتاجی میں نہ لکھا۔ اس نے جانوروں پر ظلم کے خلاف لکھا، ڈوئیل لڑنے کے رواج کے خلاف لکھا اور بین الاقوامی جھگڑوں کو جنگ کے ذریعے حل کرنے کے خلاف لکھا۔.......... کچھ ہی عرصے میں وہ اِس میگزین کا ایڈیٹر بنا۔

ایک دلچسپ واقعہ اس کی زندگی کے ساتھ یہ ہوا کہ جب برطانیہ کا یہ باشندہ، یعنی تھامس پین امریکہ پہنچا تو اُس وقت امریکی جنگِ آزادی شروع ہو چکی تھی۔ امریکہ میں برطانیہ کی تیرہ نو آبادیاں ایسی تھیں جنہوں نے اپنی آزادی کی ٹھان لی تھی۔ اور ان تیرہ نو آبادیوں نے مل کر برطانوی سلطنت سے آزاد ہونے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ بھی طے کر لیا کہ آزادی لینے کے بعد وہ 'یونائٹڈ سٹیٹس آف امریکہ' بنا کر اکٹھے رہیں گے۔

سب سے پہلے تو، برطانیہ کی اِن نو آبادیوں نے سمندر پار سے حکمرانی کرنے والی برطانوی پارلیمنٹ کی اتھارٹی کو مسترد کیا۔ 1774 تک اِن ساری نو آبادیوں میں سے ہر ایک نے ایک صوبائی کانگرس قایم کی جو 'خود حکمرانی' کا ایک ادارہ تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے ان پر فوجیں بھیج دیں۔ 1775 میں امریکیوں نے مسلح لڑائی کا فیصلہ کیا جو امریکہ کی جنگ آزادی (1775 ...... 1783) کہلائی۔ جارج واشنگٹن اِس سپاہِ آزادی کا کمانڈر بنا اور امریکی کانگریس کے ساتھ مل کر انگریز کے خلاف لڑائی کرنے لگا۔ آزادی پسند لیڈروں میں جارج واشنگٹن کے علاوہ، بنجمن فرینکلن، تھامس جیفرسن، اور سیموئل جان کاک شامل تھے۔ مگر ان کے بیچ اختلافات بھی کافی تھے۔ ایک اور بڑا مسئلہ یہ تھا کہ عام امریکی برطانیہ کے ساتھ ایک مصالحت کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

لفظ 'مسلح جدوجہد' کہنا یا لکھنا تو بہت آسان ہوتا ہے مگر اس کا لڑنا بہت مشکل کام ہے۔

خصوصاً جب آپ کے اپنے پاس اسلحہ نہ ہو، تربیت کی کمی ہو، اور آپ کا دشمن ایک با قاعدہ فوج کے علاوہ جدید ترین اسلحہ وٹریننگ سے بھی لیس ہو۔ امریکی آزادی پسندوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ اِس کا جو حل ڈھائی سو سال قبل امریکی عوام نے نکالا تھا آج بھی دنیا بھر کے انقلابی اور آزادی پسند لوگ اسی پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ امریکی عوام نے برطانوی نوآبادیاتی فوجوں کے اسلحہ خانوں پر حملے کرنے شروع کر دیے اور انہی کا اسلحہ قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح فرانس سے اسلحہ خریدنے کا خفیہ کام بھی جاری رکھا۔............الغرض، کہیں ہار کہیں فتح کا سلسلہ چلتا رہا۔

برطانیہ کے خلاف امریکہ کی آزادی کی یہ تحریک موجود تو تھی مگر سمجھو یہ سمت و نظم سے بالکل خالی تھی۔ بریز یئر بنانے والے پین کو انسان بننے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ اس نے آزادی اور سچ کو پہچان لیا۔ بے پناہ ذہانت سے سرشار تھامس پین نے غلام امریکہ کو برطانیہ سے آزاد کرانے کی لڑائی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ غلامی سچ کو قفس میں جو ڈالتی ہے۔ غلامی تو چلتے پھرتے جاگتے گاتے انسان کو دَولے شاہ کے چوہوں میں بدل دیتی ہے۔ غلامی کے خلاف ہونا بدصورتی کے خلاف ہونا ہے۔ آزادی، جمالیات ہے اور جمال و جمالیات تو تھامس پین کا پیر خانہ تھا۔

اس نے کتنی مشکلوں سے میگزین کی ایڈیٹری حاصل کی تھی۔ مگر سماجی فریضے کے سامنے نوکریوں کی کیا حیثیت؟۔ چنانچہ اس انقلابی نے ایڈیٹری چھوڑ دی اور 1776 میں کامن سینس نامی مشہورِ زمانہ پمفلٹ لکھنے جت گیا۔

کامن سینس

1776ء

حکومت پیدا کیسے ہوئی اور برطانوی آئین کیا ہے؟

کچھ لکھاریوں نے سماج کو حکومت کے ساتھ اس قدر گڈمڈ کر دیا ہے کہ گویا ان دونوں کے درمیان بالکل کوئی فرق نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختلف ہیں بلکہ الگ الگ ابتدا رکھتے ہیں۔ سماج تو ہماری خواہشات سے پیدا ہوا ہے مگر، حکومت ہماری مکاری سے۔ سماج ہماری محبتوں کو متحد کر کے ہماری مسرت کو 'مثبت' طور پر بڑھاوا دیتا ہے۔ اور حکومت 'منفی طور پر' ہماری بدکاریوں کو دباتی ہے۔ سماج میل جول کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جبکہ حکومت امتیازات پیدا کرتی ہے۔ سماج ایک سرپرست و پشت پناہ ہے، جبکہ حکومت ایک سزا دہندہ۔

سماج ہر حالت میں ایک نعمت ہے۔ مگر حکومت اپنی بہترین حالت میں بھی ایک لازمی شر ہے۔ حکومت اپنے بدترین حالات میں تو بالکل ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے کہ جب ہم دکھ میں ہوتے ہیں یا 'ایک حکومت کی طرف سے' اُنہی مصیبتوں کا سامنا کرتے ہیں، جن کا کہ ہم بغیر حکومت کے ایک ملک میں سامنا کرنے کی توقع کر سکتے ہیں، تو ہماری آفت اس احساس کے بعد بڑھ جاتی

ہے کہ ہم ہی وہ ذرائع مہیا کرتے ہیں جن سے ہم دکھ اٹھاتے ہیں۔ حکومتیں، لباسوں کی طرح، گم گشتہ معصومیت کی شناخت ہوتی ہیں۔ بادشاہوں کے محل بہشت کی گپھاؤں کے کھنڈرات پر تعمیر ہوتے ہیں۔ اگر ضمیر کی اکساہٹیں صاف، اور ہم آہنگ ہوتیں اور ناقابلِ مزاحمت انداز میں مانی جاتیں تو انسان کو کسی اور قانون دہندہ کی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ، بقیہ جائیداد کی حفاظت کے لیے ذرائع مہیا کرنے کے واسطے اپنی جائیداد کے ایک حصے سے دستبردار ہو جائے۔ اور اسے ایسا کرنے پر وہی پیداوار مجبور کرتی ہے جو ہر دوسرے معاملے میں اسے مشورہ دیتی ہے کہ وہ دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی منتخب کرے۔ چونکہ امن و امان حکومت کا اصل مقصد اور ہدف ہے، تو ہوتا یہ ہے کہ ہم پر اس کی جو بھی صورت کم خرچ اور زیادہ مفید امن و امان کی یقین دہانی کراتی نظر آئے وہ دوسری ساری صورتوں پر ترجیح رکھتی ہے۔

حکومت کے ہدف اور مقصد کے ایک واضح اور منصفانہ تصور کو سمجھنے کے لیے آیئے ہم لوگوں کی ایک چھوٹی تعداد کا تصور کریں جو زمین کے کسی الگ تھگ گوشے میں دوسروں سے الگ تھلگ آباد ہیں۔ گویا وہ دنیا کی اولین انسانی آبادکاری کی نمائندگی کرتے ہوں۔ قدرتی آزادی کی اس حالت میں، ان کا پہلا خیال 'سماج' کے قیام کا ہوگا۔ ہزاروں محرکات انہیں اس پر اکسائیں گے۔ ایک آدمی کی طاقت اُس کی ضروریات سے اس قدر غیر مساوی ہے، اور اُس کا ذہن ابدی تنہائی کے لیے اس قدر غیر موزوں ہے، کہ وہ جلد ہی ایک اور انسان کی مدد ڈھونڈنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی اُسی کچھ کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ یہ چار پانچ ملے ہوئے اشخاص ایک بیابان کے بیچ میں ایک قابلِ برداشت مسکن کھڑا کرتے ہیں۔ مگر ایک شخص زندگی کے اسی عرصے کو انفرادی طور پر محنت کرنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ جب وہ درخت کا، تنا کاٹ کر گراتا ہے تو اسے اکیلے ہٹا نہیں پاتا۔ اور اگر یہ ہٹا بھی دیا گیا تو وہ اُسے سیدھا نہیں کھڑا کر پاتا۔ اسی دوران بھوک اُسے کام چھوڑ دینے پر مجبور کر سکتی ہے، اور ہر مختلف ضرورت اُسے مختلف انداز میں بلاتی ہے۔ بیماری کو تو چھوڑیئے حتیٰ کہ بدبختی بھی موت ہوگی۔ اس لیے کہ خواہ بیماری اور بدبختی اُسے موت نہ بھی دیتی ہوں پھر بھی اُسے مفلوج تو بنا ڈالتی ہیں۔ اور اسے ایک ایسی بدتر حالت تک پہنچا سکتی ہیں جس میں وہ

موت سے زیادہ برباد ہوسکتا ہے۔

لہٰذا لزومیت، ایک کششِ ثقلی قوت کی طرح، جلد ہی ہمارے اِن نئے پہنچے تارکینِ وطن کو ایک سماج میں بدل دے گی۔ جس کی باہم دگر نعمتیں قانون اور حکومت کے قانون کی پابندی کو ہٹا کر اُن کی جگہ لیں گی اور اسے غیر ضروری بنائیں گی جب تک کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے مکمل منصفانہ رہیں۔ مگر چوں کہ صرف اور صرف آسمان بدکاری و گناہ سے پاک ہے، لہٰذا ناگزیر طور پر ایسا ہوگا کہ جونہی وہ مہاجرت کی اولین مشکلات کو قابو کریں گے (مشکلات، جو کہ انہیں ایک مشترکہ مقصد میں باندھ دیں گی) اسی تناسب سے وہ اپنے فرض اور ایک دوسرے سے وابستگی سے سست ہونا شروع ہوں گے۔ اور یہ غفلت اخلاقی نیکی کی کمی کو کمک فراہم کرے گی اور حکومت کی کسی شکل کے قیام کی ضرورت کی طرف اشارہ کرے گی۔

کوئی بڑا سایہ دار درخت انہیں ایک 'سٹیٹ ہاؤس' مہیا کر سکے گا، جس کی شاخوں کے نیچے ساری آبادی جمع ہو کر عوامی معاملات پر بحث و فکر کر سکے گی۔ اُن کے اولین قوانین محض ہدایات کا نام پائیں گے اور وہ قوانین عوامی بے توقیری کی کسی سزا کے بغیر لاگو نہ ہوں گے۔ اس اولین پارلیمنٹ میں قدرتی حق کے ذریعے ہر شخص کا ایک ووٹ ہوگا۔

مگر جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے عوامی مسائل بڑھتے جائیں گے، اور وسیع تر آبادی میں افراد کی رہائش گاہوں کے بیچ فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ اُن سب کے لیے پہلے کی طرح ہر موقع پر ملنا تکلیف دہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ انھیں اس بات پہ متفق ہونے کی طرف لے جائے گا کہ آئین سازی کے حصے کی انتظام کاری سارے لوگوں میں سے منتخب ایک متعین تعداد کے سپرد کی جائے، جن کے پاس وہی مسائل ہوں جو کہ انہی لوگوں کو ہوتی ہیں جنہوں نے انہیں منتخب کیا۔ اور وہ اُسی طرح عمل کریں گے جس طرح ساری آبادی کرتی، اگر وہ موجود ہوتی۔ اگر آبادی اپنی بڑھوتری جاری رکھتی ہے تو نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نیز آبادی کے ہر حصے کے مفادات کا خیال رکھنے کے لیے سارے مجموعے کو باسہولت حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔ ہر حصہ 'پارلیمنٹ' میں اپنی مخصوص تعداد بھیجے۔ 'منتخب' لوگ اپنے لیے، منتخب کرنے والوں سے کوئی الگ

مفاد نہیں بنائیں گے۔ یہ پارلیمنٹ الیکشنوں کے بار بار ہونے کو معقولیت قرار دے گی۔ اس لیے کہ اس طرح 'منتخب شدہ' افراد چند ماہ کے بعد دوبارہ انتخاب کرنے والوں میں واپس آ جائیں گے، اُن کے ساتھ دوبارہ گھل مل جائیں گے۔ پبلک کو اُن کی فرض شناسی اس بات سے معلوم ہوگی کہ وہ پبلک کے لیے ڈنڈا استعمال نہ کریں۔ اور جوں جوں جلد جلد والی ادل بدل (الیکشن) کمیونٹی کے ہر حصے کے ساتھ ایک مشترکہ مفاد قائم کرے گی، تو وہ فطری طور پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اور اسی عمل پر (نہ کہ بادشاہ کے بے معنی نام پر) 'حکومت کی قوت' اور 'جن پر حکومت کی جاتی ہے، اُن کی مسرت' انحصار کرتی ہے۔

تب یہیں پر حکومت کی ابتدا اور بڑھوتری ہوتی ہے۔ یعنی دنیا پر حکومت کرنے کی اخلاقی نیکی کی لاچاری کے ذریعے ایک ضروری تعملی طرز۔ یہاں بھی حکومت کا مقصد اور ہدف، آزادی اور امن و امان ہے۔ اور ہماری آنکھیں منظر سے خواہ جتنی بھی چندھیا جائیں، ہمارے کان جتنا بھی آواز سے دھوکہ کھائیں، خواہ جتنا بھی تعصب ہمارے ارادوں سے لپٹ جائے، خواہ جتنا بھی مفاد ہماری تفہیم کو سیاہ بنا دے، فطرت اور دلیل کی سادہ آواز کہے گی، ''یہ صحیح ہے''۔

میں حکومت کی شکل کا اپنا تصور فطرت کے ایک اصول سے لیتا ہوں جسے کوئی آرٹ تباہ نہیں کر سکتا۔ وہ یہ ہے کہ کوئی چیز جتنی سادہ ہوگی، اس کے بدانتظام ہونے کا امکان اُتنا کم ہوگا۔ اور جب وہ خراب ہو جائے تو آسانی سے مرمت ہوتی ہے؛ اور اس کہاوت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں انگلینڈ کے اس قدر مبالغہ آمیز تعریفوں والے آئین پر چند جملے پیش کرتا ہوں۔ یہ بات تو تسلیم ہے کہ، ''یہ آئین جن تاریک و غلامانہ زمانوں میں قایم کیا گیا، وہاں یہ اعلیٰ تھا''۔ جب دنیا آمریت سے کچلی ہوئی تھی، تو یہ آئین ایک شاندار نجات تھا۔ مگر یہ بات آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے کہ یہ نامکمل ہے، افراتفری کے دوروں کے زیر اثر ہے، اور ان چیزوں کے لائق نہیں ہے جن کا یہ وعدہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

آمرانہ حکومتیں (گو کہ انسانی فطرت کی توہین ہوتی ہیں) اپنے اندر یہ فائدہ رکھتی ہیں، کہ وہ سادہ ہوتی ہیں۔ اگر لوگ تکلیف میں آ جائیں، تو وہ اُس سرچشمے کو جانتے ہیں جہاں سے ان کی

مصیبت ابھرتی ہے۔ اسی طرح وہ اس کا مداوا جانتے ہیں ۔ اور اسباب و علاجوں کے جھمگھٹے سے سراسیمہ نہیں ہوتے ۔مگر انگلینڈ کا آئین اس قدر پیچیدہ ہے، کہ وہ قوم یہ معلوم کرنے کے قابل ہوئے بغیر کہ خرابی کس حصے میں ہے، برسوں تک مصیبت بھگت سکتی ہے ۔ کچھ کہیں گے کہ خرابی یہاں ہے، باقی بولیں گے وہاں ہے، اور ہر سیاسی ڈاکٹر ایک الگ دوا تجویز کرے گا۔

میں جانتا ہوں کہ مقامی یا طویل وقت کے تعصّبات پہ قابو پانا مشکل ہے۔ پھر بھی اگر ہم برطانوی آئین کے مختلف حصوں کا جائزہ لیں، تو ہم انہیں کچھ نئے ریپبلکن موادوں کی آمیزش کے ساتھ دو قدیم استبدادوں کی باقیات پر مبنی دیکھیں گے:

اولاً: بادشاہ کی ذات میں ارسٹوکریٹک استبداد کی باقیات۔

ثانیاً: نوابوں کی ذات میں ارسٹوکریٹک استبداد کی باقیات۔

سوم: نیا رپبلکن مواد، کامنز کی ذاتوں میں، جن کی نیکی پہ انگلینڈ کی آزادی کا انحصار ہے۔

اول الذکر دونوں، موروثی ہوتے ہوئے، عوام سے ماورا ہیں۔ اس وجہ سے' آئینی حوالے سے' وہ ریاست کی آزادی کی طرف کچھ بھی حصہ نہیں ڈالتے۔

یہ کہنا کہ انگلینڈ کا آئین تین طاقتوں کا 'اتحاد' ہے، جو ایک دوسرے کے چیک اور بیلنس ہیں، ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ یا تو اس لفظ کے معنی کچھ نہیں ہیں، یا وہ سیدھا سیدھا تضادات سے بھرا ہوا ہے۔

یہ کہنا کہ 'ہاؤس آف کامنز' بادشاہ کے لیے ایک رکاوٹ ہے، دو چیزوں کو فرض کر لیتا ہے
۔

ایک: یہ کہ بادشاہ پر دیکھ بھال کیے بغیر بھروسہ نہیں کیا جائے، یا دوسرے لفظوں میں مطلق اقتدار کی پیاس بادشاہت کی فطری بیماری ہے۔

دو: یہ کہ کامنز، اس مقصد کے لیے مقرر کیے جانے سے، یا تو بادشاہ سے زیادہ عقل مند ہیں یا زیادہ قابلِ اعتبار ہیں۔

مگر چونکہ یہی آئین جو کہ کامنز کو، اخراجات روک دینے کے ذریعے بادشاہ کو روکنے

ٹوکنے کا اختیار دیتا ہے، بعد میں بادشاہ کو اُن کے بلوں کو مسترد کرنے کا اختیار دے کر کامنز کو روکنے ٹوکنے کا اختیار دیتا ہے ۔ یہ پھر فرض کرتا ہے کہ بادشاہ اُن سے زیادہ عقل مند ہے، جنہیں اس نے پہلے اپنے سے زیادہ عقل مند ہونے کا فرض کیا ہے۔ محض ایک بیہودہ بات!۔

بادشاہت اور موروثی جانشینی

تخلیق کے حساب سے سارے انسان آغاز میں برابر ہوتے ہیں ۔اس برابری کو صرف بعد میں آنے والی کوئی صورت حال ہی برباد کر سکتی ہے ۔اس سلسلے میں امیری اور غریبی کے فرق کو سب سے زیادہ گردانا جاتا ہے۔ استبداد اور حرص کے کھردرے اور برے لگنے والے نام بھی گردانے جاتے ہیں۔ استبداد عموماً دولت کا 'نتیجہ' ہوتا ہے، یہ اس کا 'ذریعہ' شاذونادر ہوتا ہے یا کبھی بھی نہیں ہوتا ۔اور گو کہ حرص کسی شخص کو لازماً غریب ہونے سے بچاتا ہے، مگر یہ عموماً اسے دولت مند ہونے سے زیادہ ہی ڈراتا ہے۔

مگر ایک اور بڑا فرق بھی ہے جس کے لیے کوئی فطری یا مذہبی سبب مقرر نہیں کیا جا سکتا، وہ ہے؛ انسانوں کی 'بادشاہوں' اور 'رعایا' میں تقسیم۔ نر اور مادہ تو فطرت کے امتیاز ہیں، اچھا اور برا آسمان کے دیے ہوئے امتیاز ہیں، مگر اس بات کی تحقیق ہونی چاہیے کہ دنیا میں انسانوں کی ایک نسل (بادشاہوں کی) کس طرح بقیہ انسانوں سے اس قدر عالی مقام پہ آئی اور ایک نئی نسل و نوع (Species) کی طرح ممتاز ہوئی۔ یہ تحقیق بھی ہونی چاہیے کہ آیا وہ بنی نوعِ انسان کے لیے خوشی کا وسیلہ ہیں، یا دکھ اور بربادی کا۔

مذہبی کرانالوجی کے مطابق شروع شروع میں دنیا کے اندر بادشاہوں کا وجود نہ تھا۔ اسی لیے جنگیں نہ تھیں۔ یہ بادشاہوں کا تکبر ہے جو بنی نوعِ انسان کو مصیبت میں ڈالتا ہے ۔ہالینڈ کسی بادشاہ کے بغیر اس آخری صدی میں یورپ میں کسی بھی شاہی حکومت سے زیادہ امن کے مزے لوٹتا رہا۔ قدیم زمانہ اسی رائے کی حمایت میں گواہی دیتا ہے، اس لیے کہ اولین پدرسری کی خاموش اور

دیہی زندگیوں میں ان کے اندر مسرت جیسی کوئی چیز موجود تھی ، جو اُس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہم بادشاہت کی تاریخ تک آتے ہیں۔

دنیا میں بادشاہوں کی طرف سے حکومت سب سے پہلے کفرستان نے متعارف کرائی تھی ، جن سے یہ رواج ’اسرائیل‘ کے بچوں نے نقل کیا۔ یہ اُن ایجادات میں سب سے مالا مال ایجاد تھی جو شیطان نے آج تک بت پرستی کی ترویج کے لیے کیں۔ اہلِ کتاب سے پہلے کے لوگ تو اپنے مرے ہوئے بادشاہوں کو الوہی احترام دیتے تھے، اور مسیحی دنیا نے اپنے زندہ بادشاہوں کے ساتھ یہی کچھ کر کے شیطانی منصوبے کو بہتر بنایا ہے۔ ایک ایسے کیڑے کو مقدس میجسٹی کا لقب دینا کس قدر ناپاک بات ہے جو اپنی شان وشوکت کے عین شباب میں گرد و غبار میں منہدم ہو رہی ہے۔

بادشاہت کی برائی میں ہم نے موروثی جانشینی کی برائی بھی ڈال دی ہے۔ اور جس طرح بادشاہت ہمارے اپنے ہاتھوں سے ہم کو ذلیل اور کمتر بناتی ہے، اسی طرح موروثی جانشینی، بعد کی آنے والی نسل کی توہین ہے۔ چونکہ سارے انسان آغاز میں برابر ہیں، اس لیے کسی کو بھی پیدائشی طور پر یہ حق نہیں کہ وہ ذاتی طور پر اپنے خاندان کو تمام دوسروں پر، ہمیشہ کے لیے، مسلسل ترجیح دے۔ گو کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے اعزازات کے کچھ زیادہ درجے کا حقدار ہو، مگر اس کے ورثا اُن اعزازات کو ترکے کے بطور وصول کرنے میں بہت ہی نالائق ہوتے ہیں۔ بادشاہوں میں موروثی حق کی بے وقوفی کا ایک مضبوط ترین فطری ثبوت یہ ہے کہ ’قدرت‘ اسے نامنظور کرتی ہے، وگرنہ قدرت بنی نوعِ انسان کو ’شیر کی جگہ گدھا‘ دے کر اُسے بار بار مضحکہ خیز نہ بناتی۔

اعزازات کے عطا کرنے والوں کے پاس آنے والی نسل کا حق غصب کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ ’ہم تمہیں اپنا سربراہ چنتے ہیں‘ مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ’تمہارے بچے اور تمہارے بچوں کے بچے ہمارے بچوں کے بچوں پر ہمیشہ کے لیے حکمرانی کریں گے‘۔ اس طرح کا بے عقل، بے انصاف، اور غیر فطری معاہدہ اگلی موروثی جانشینی میں انہیں ایک غنڈے یا ایک احمق کی حکومت کے تحت ڈال سکتا ہے۔ دانا ترین آدمیوں کی اکثریت نے ہمیشہ موروثی حق کو توہین آمیز نظروں سے دیکھا ہے۔ یہ اُن برائیوں میں سے ایک ہے جو اگر ایک بار قایم

ہو جائے تو آسانی سے دور نہیں کی جاسکتی۔ بہت سارے لوگ تو خوف سے جھک جاتے ہیں، اور باقی اوہام سے۔ اور بادشاہ کے ساتھ زیادہ طاقت ور حصہ باقیوں کے لوٹ مار میں حصہ دار ہوتا ہے۔

یہ فرض کرنا غیر حقیقی ہے کہ بادشاہوں کی موجودہ نسل کی کوئی معزز ابتدا تھی۔ ہم اگر عہدِ قدیم کے دبیز پردے اٹھائیں اور اولین بادشاہ دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ کسی بے آرام بدمعاش گینگ کے سربراہ سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھا جس کے دوسروں سے زیادہ مکارانہ سفاک طریقوں نے اسے ڈاکوؤں میں سے چیف کا نام دلایا۔ اُس نے طاقت میں اضافے اور اپنے لوٹ کھسوٹ کو توسیع دیتے ہوئے خاموش اور بے دفاع انسان کو بار بار کے چندوں کے ذریعے اپنی حفاظت خریدنے پر خوف دلایا۔ پھر بھی اُس کے منتخب کرنے والوں کو اُس کی نسل کو موروثی حق دینے کا کوئی خیال نہ تھا، اس لیے کہ خود اُن کا اس طرح کا دائمی اخراج آزاد اصولوں سے غیر مطابق تھا جس پہ وہ زندگی گزارنے کی تبلیغ کرتے آتے تھے۔ چنانچہ بادشاہت کے اوائلی وقتوں میں موروثی جانشینی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ بادشاہت اتفاقیہ یا کسی وصف کی بنا پر ملتی تھی۔ مگر چونکہ اُن وقتوں میں معمولی ریکارڈ یا بالکل کوئی بھی ریکارڈ موجود نہ تھا، اور روایتی طور پر تاریخ قصے کہانیوں سے بھری ہوتی تھی، اس لیے کچھ نسلیں گزرنے کے بعد یہ کام بہت آسان تھا کہ موروثی حق جتانے کو بازاری لوگوں کی زبان پہ کسی موزوں کردہ وقت پہ مافوق الفطرت کہانی گھڑی جائے۔ شاید اُن بدنظمیوں نے جو ایک لیڈر کی کمی پر اور ایک نئے کے انتخاب (اس لیے کہ ڈاکوؤں کے درمیان انتخابات نظم وضبط سے نہیں ہوسکتے) کو خطرے میں ڈالتی تھیں یا یہ انتخاب خطرہ لگتے تھے، انتخاب کو موروثی ڈھونگوں کے حق میں کر دیا۔ جس سے موروثی حکمرانی وقوع پذیر ہوئی۔ جو بات پہلے ایک سہولت کے بطور تسلیم کی گئی بعد میں ایک حق کے بطور اس کا دعویٰ کیا گیا۔

انگلینڈ نے فتح کے بعد چند اچھے بادشاہ دیکھے مگر ان کی پشت پر بروں کی ایک بہت بڑی تعداد لا دی۔ پھر بھی کوئی شخص اپنے ہوش وحواس میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ولیم دی کنکرر کے تحت اُن کا دعویٰ ایک بہت ہی معزز دعویٰ ہے۔ یہ سادہ لفظوں میں ایک بہت ہی گھٹیا بدمعاشی ہے۔ ایک فرانسیسی حرامی، مسلح غنڈوں کے ساتھ آن وارد ہوا۔ اور اس نے مقامی آبادی کی رضا کے خلاف خود کو

انگلینڈ کا بادشاہ قرار دیا۔ بلاشبہ اس کے اندر کوئی دیوتائی نہیں ہے۔ موروثی حق کی حماقت کو بے نقاب کرنے پر زیادہ وقت صرف کرنا میرے لیے غیر ضروری ہے۔ اگر اس پر ایمان رکھنے والا کوئی کمزور موجود ہے تو اسے اکٹھے گدھے اور شیر کی عبادت کرنے دو۔ میں نہ اُن کی عاجزی کی نقل کروں گا اور نہ اُن کی عبادت کو ڈسٹرب کروں گا۔

میں پوچھتا ہوں کہ اُن کے خیال میں بادشاہ پہلے پہلے آئے کیسے؟۔ اس سوال کے تین جوابات ہیں؛ وہ یا تو قرعہ اندازی سے آئے، یا الیکشن سے آئے، اور یا پھر قبضہ سے۔ اگر اولین بادشاہ قرعہ سے لیا گیا تھا، تو یہ اگلے کے لیے ایک نظیر متعین کرتا ہے، جو کہ موروثی حکمرانی کو خارج کرتا ہے۔ ساؤل قرعہ اندازی سے آیا تھا مگر اس کا جانشین موروثی نہ تھا، نہ ہی اُس سمجھوتے سے یہ نظر آتا ہے کہ اس طرح کرنے کا کوئی ارادہ بھی تھا۔ اگر کسی ملک کا اولین بادشاہ الیکشن کے ذریعے تھا، تو وہ بھی اگلے بادشاہ کے لیے ایک نظیر بناتا ہے۔ یہ کہنا کہ اولین انتخاب کرنے والوں کی طرف سے محض ایک بادشاہ کا انتخاب نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے بادشاہوں کے ایک خاندان کے انتخاب سے مستقبل کی ساری نسلوں کا حق لے لیا گیا ہے، تو اس کا تو کتابِ مقدس کے اندر باہر کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ابتدائی گناہ کے ڈوکٹرائن، جو فرض کرتا ہے کہ حضرت آدم میں سارے انسانوں کی آزادانہ رائے ختم ہو چکی۔ اور اس طرح موازنے سے، موروثی جانشینی کوئی شان حاصل نہیں کر سکتی۔ آدم کی صورت میں سب نے گناہ کیا، جس طرح کہ بادشاہ کے اولین انتخاب کرنے والوں کی صورت میں سارے انسانوں نے اطاعت کی۔ یعنی کہ ایک کی صورت میں ساری انسانیت شیطان کے سامنے محکوم ہو گئی، اور دوسری میں بادشاہ کے سامنے۔ جس طرح اول الذکر میں ہماری معصومیت ضائع ہو گئی، اسی طرح ثانی الذکر میں ہماری اتھارٹی۔ اور جس طرح کہ دونوں ہمیں کچھ سابقہ حالت اور حق کے دوبارہ لینے کے ناقابل بناتے ہیں تو یہ حتمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی گناہ اور موروثی جانشینی متوازی ہیں۔ ناقابلِ احترام...... بے شان۔

اگر ہم بادشاہ کے کام کے بارے میں تحقیق کریں تو ہم دیکھیں گے کہ کچھ ممالک میں اُن کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوگا، اور خود کو مسرت دیے بغیر یا قوم کو فائدہ دیے بغیر اپنی زندگیاں فضول

گزارنے کے بعد، منظر سے ہٹ جاتے ہیں، اور اپنے جانشینوں کو اسی بے کار دائرے میں چلنے چھوڑتے ہیں۔ مطلق بادشاہوں میں سول اور ملٹری کام کا سارا بوجھ بادشاہ پر ہوتا ہے۔ اسرائیل کے بچوں نے ایک بادشاہ کے لیے درخواست اِس حاجت کو پورا کرنے کے لیے کی کہ 'وہ ہماری عدالت کرے، اور ہم سے پہلے باہر جائے اور ہماری جنگیں لڑے'۔ مگر انگلینڈ جیسے ممالک میں وہ نہ تو جج ہے اور نہ جرنیل، اس لیے انسان حیران ہو جاتا ہے کہ اس کا کام ہے کیا؟۔

ایک حکومت جس قدر ایک ریپبلک و جمہوریہ کے قریب پہنچتی ہے، بادشاہ کا کام اتنا ہی کم ہو جاتا ہے۔ سر ولیم میریڈتھ اُسے ایک ریپبلک کہتا ہے؛ مگر اپنی موجودہ صورت میں یہ اس نام کے لائق نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تاج کے کرپٹ اثر میں ہے، سب جگہیں اس کے حوالے ہیں، اس نے اقتدار کو اس قدر موثر طور پر نگل لیا ہے، کہ حکومتِ انگلینڈ قریب قریب اسی قدر بادشاہت والی ہے جس طرح کہ فرانس اور سپین کی حکومت۔ لوگ سمجھے بغیر ناموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انگلینڈ کے آئین کے ریپبلکن حصہ پر انگریز ناز کرتے ہیں، یعنی خود اپنے جیسوں میں سے ایک کو ہاؤس آف کامنز کے انتخاب کی آزادی ہوتی ہے.......... اور یہ دیکھنا آسان ہے کہ جب ریپبلکن خوبیاں ناکام ہوتی ہیں، تو غلامی تعاقب کرتی ہے۔ انگلینڈ کا آئین بیمار بیمار سا ہے، صرف اس لیے کہ بادشاہت نے ریپبلک کو زہر آلود کیا، تاج نے کامنز کو جذب کر لیا ہے۔

انگلینڈ میں کسی بادشاہ کے پاس جنگ چھیڑنے اور علاقے مفت انعام دینے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ جس کا سادہ الفاظ میں مطلب ہے؛ قوم کو کنگال کر دینا۔ یہ ایک ایسے شخص کے لیے واقعی بہت اچھا کاروبار ہے جسے اس کام کے لیے سالانہ آٹھ سو ہزار (اسی لاکھ) سٹرلنگ خرچ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اب تک جتنے بھی تاج و تخت والے بدمعاش گزرے ہیں، اُن سب میں سے خدا کی نظر میں اور سماج کی نظر میں بھی وہ شخص زیادہ پیارا ہے جو ایماندار ہو۔

امریکہ کی موجودہ صورت حال

اگلے صفحات پر میں سادہ حقائق، صاف دلائل اور کامن سینس سے زیادہ کچھ بھی پیش نہیں کروں گا۔ اور قاری سے اِس کے سوا کوئی اور تمہیدی باتیں نہیں کروں گا، کہ وہ خود کو تعصب اور بدگمانی سے پاک کرے، اور اپنے استدلال اور احساسات کو خود متعین کرے۔ یہ بھی کہ وہ ایک شخص کے اصل کردار کو پہن لے، یا بلکہ وہ اسے اتارے نہیں، اور اپنے تصورات کو سخاوت کے ساتھ ’آج‘ سے آگے وسعت دے۔

انگلینڈ اور امریکہ کے درمیان جدوجہد کے موضوع پر جلدوں کی جلدیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس تنازعہ میں مختلف مقاصد اور مختلف عزائم کے ساتھ، ہر طرح کے لوگ کودے ہیں۔ مگر سب ناکام ہوئے اور مباحثے کا وقت بند ہوا۔ ہتھیار بطور آخری وسیلہ، مقابلے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اپیل بادشاہ کا آخری انتخاب تھا، اور غلام کالونیوں نے چیلنج کو قبول کیا ہے۔

ایک عظیم تر قدر والے نصب العین کے لیے حالات کبھی بھی آسان نہ رہے۔ یہ ایک شہر، ایک ملک، ایک صوبے یا سلطنت کی بات نہیں ہے بلکہ ایک براعظم کی بات ہے۔ رہائش کے قابل کرہِ ارض کے کم از کم آٹھویں حصے کی بات ہے۔ یہ ایک دن، ایک سال، یا ایک عمر کا معاملہ نہیں ہے بلکہ آنے والی نسل اس مقابلے میں خود شامل ہے اور وہ اب کی کاروائیوں سے وقت کے آخر تک، کم یا زیادہ متاثر ہوں گے۔ اب امریکی ریاستوں کی یونین کی تخم ریزی کا وقت ہے، یقین اور وقار کی تخم ریزی کا۔ آج کی ذرا سی شکست و ریخت اسی طرح ہوگی جس طرح کہ سوئی کی نوک سے ایک نوخیز شاہ بلوط کی نازک جلد پہ ایک نام کندہ کیا جائے۔ زخم درخت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا اور آنے والی نسل اسے مکمل طور پر بڑے ہوئے حروف کے بطور پڑھے گی۔

معاملے کو دلیل کے بجائے اسلحہ کی طرف بھیجنے سے سیاست میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے، فکر کا ایک نیا طریقہ ابھرا ہے۔ 19 اپریل (جھڑپوں کی شروعات) سے قبل کے سارے

منصوبے اور تجاویز گذشتہ سال کی جنتریوں کی طرح ہیں، جو گو کہ اُس وقت تو مناسب تھے، مگر اب ناکارہ ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ دوسرے لے چکی ہیں۔ اُس وقت مسئلے کے دونوں طرفین کی جانب سے جو کچھ بھی پیش کیا گیا، وہ ایک ہی نقطے پر آن ختم ہوا، یعنی برطانیہ سے ایک اتحاد۔ دونوں میں فرق محض اس بات پہ تھا کہ اس پر عمل کیسے ہو۔ ایک طاقت کی تجویز کر رہا تھا، دوسرا دوستی کی۔ مگر اب تک ہوا یہ کہ اول الذکر ناکام ہو گیا ہے، اور دوسرے نے اپنا اثر کھو دیا ہے۔

مصالحت کے فوائد کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مصالحت تو ایک خواب کی طرح گزر گئی ہے اور ہمیں اُسی طرح چھوڑ گئی ہے جس طرح کہ ہم تھے۔ ہمیں دلیل کے متضاد پہلو کا بھی جائزہ لینا چاہیے، اور اُن بہت سے مادی زخموں میں سے کچھ کی تحقیق کرنی چاہیے جو یہ غلام کالونیاں برطانیہ سے منسلک اور محتاجی میں سہتی ہیں اور ہمیشہ سہتی رہیں گی۔ فطرت اور کامن سنس کے اصولوں پر اس منسلکی اور محتاجی کا جائزہ لینا چاہیے۔ اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم علیحدہ ہوئے تو ہمیں کس پہ اعتبار کرنا ہے، اور اگر غلام رہے تو ہمیں کیا توقع کرنی ہے۔

میں نے کچھ لوگوں کو اس بات پہ زور دیتے ہوئے سنا کہ چونکہ غلام امریکہ برطانیہ کے ساتھ اپنے سابقہ غلامی والے تعلق کی بنا پر ترقی کر چکا ہے، اس لیے وہی تعلق اس کے مستقبل کی مسرت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس طرح کی دلیل سے زیادہ گمراہی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ہم بھی زور دے سکتے ہیں کہ ایک بچہ گوشت کی بجائے دودھ پر پلا بڑھا ہے، یا یہ کہ ہماری زندگیوں کے اولین بیس برس اگلے بیس برس کے لیے قابلِ تقلید ہوں گے۔ اس لیے کہ میں صاف صاف جواب دیتا ہوں کہ غلام امریکہ اتنا ہی ترقی کرتا، اور شاید اس سے بھی زیادہ، اگر کوئی یورپی طاقت اُس کو اُس کے حال پہ رہنے دیتی۔ جس تجارت سے اس نے خود کو امیر کیا ہے وہ زندگی کے لیے ضرورتیں ہیں، اور جب تک کھانا یورپ کا رواج رہے گا، اس کی ہمیشہ ایک منڈی ہوگی۔

کچھ کہتے ہیں’ کہ برطانیہ نے ہماری حفاظت کی‘۔ اس نے ہمیں موہ لیا ہے سچ ہے، اور ہماری قیمت پر نیز اپنی قیمت پر اس خطے کا دفاع کیا ہے، تسلیم۔ اور وہ انہی اغراض کے لیے ترکی کا دفاع بھی کر چکا ہوتا۔ یعنی تجارت اور بالادستی کے لیے۔

افسوس! قدیم تعصّبات ہمیں مدتوں تک گمراہ رکھ چکے ہیں اور ہم مافوق الفطرت کے لیے عظیم قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ ہم نے برطانیہ کی طرف سے حفاظت کی ڈینگیں ماری ہیں، یہ سوچے بغیر، کہ اس کی غرض 'مفاد' تھا نہ کہ 'محبت'۔ اور یہ کہ اس نے ہماری حفاظت 'ہمارے دشمنوں سے ہماری خاطر' نہیں کی بلکہ 'اپنے دشمنوں سے، اپنی خاطر' کی ہے۔ اس نے اُن لوگوں سے ہماری حفاظت کی جن کا ہم سے 'کسی' اور بات' پہ کوئی جھگڑا نہ تھا، اور جو 'اسی کی وجہ سے، ہمیشہ ہمارے دشمن رہیں گے۔ اگر برطانیہ غلام امریکہ پر اپنے دعوؤں سے دست بردار ہوتا، یا غلام امریکہ اس پر انحصار کو اتار پھینکتا ،تو ہم فرانس وسپین سے امن میں ہوتے، وہ تو برطانیہ سے جنگ میں ہوتے۔

حال میں برطانوی پارلیمنٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ غلام نو آبادیوں کا سوائے والد ملک کے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی پنسلوانیا اور جرسی، انگلینڈ کے حوالے سے 'بہن نو آبادیاں' ہیں۔ یقیناً یہ تعلق کو ثابت کرنے کا ایک بہت ہی پر پیچ راستہ ہے۔ مگر یہ دشمنی ثابت کرنے کا نزدیک ترین اور واحد سچا راستہ ہے۔ امریکی کے بطور، فرانس اور سپین تو کبھی بھی ہمارے دشمن نہ رہے، نہ ہی وہ شاید کبھی ہوں گے، مگر برطانیہ کی رعایا ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے دشمن ہیں۔

مگر کچھ کہتے ہیں کہ برطانیہ والد ملک ہے۔ پھر تو اُس سلوک پر لعنت ہو۔ اس لیے کہ وحشی سے وحشی درندہ بھی اپنے بچوں کو چیرتا پھاڑتا نہیں اور ہڑپ نہیں کرتا، نہ ہی درندے اپنے خاندانوں سے جنگ لڑتے ہیں۔ 'والد یا والدہ ملک' کی اصطلاح اس کے جونکوں نے مسیحیت میں اپنائی ہے، ہمارے ذہنوں کی سریع الاعتقاد کمزوری پر ایک ناجائز تعصب حاصل کرنے کے ایک پوپ پرستانہ نیچ عزائم کے ساتھ۔ امریکہ کا والد ملک یورپ ہے نہ کہ انگلینڈ۔ یہ نئی دنیا (امریکہ) یورپ کے 'ہر کونے' سے سول اور مذہبی آزادی کے ایذا رسیدہ عشاق کے لیے جائے پناہ رہی ہے۔ وہ اِدھر فرار ہوئے ہیں، ماں کی مہرباں آغوش سے نہیں بلکہ راکشس کے ظلم سے۔ اور یہ بات یہاں، انگلینڈ کے لیے درست ہے، کہ وہ استبداد جس نے اولین تارکینِ وطن کو گھر سے باہر کر دیا تھا، ابھی تک اُن کی آل اولادوں کا تعاقب کرتا ہے۔

کرہِ ارض کے اِس وسیع حصے میں، ہم تین سو ساٹھ میل کی تنگ حدود کو بھول جاتے ہیں

(انگلینڈ کا رقبہ)، اور اپنی دوستی کو ایک وسیع تر حد تک لے جاتے ہیں۔ ہم ہر یورپی مسیحی سے بھائی چارے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اس جذبہ کی سخاوت میں فتح کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہ مشاہدہ کرنا خوشگوار ہے کہ باقاعدہ تدریج سے ہم مقامی تعصّبات کی قوت پر غلبہ پاتے ہیں، ہم دنیا کے ساتھ اپنی شناسائی کو وسیع کرتے ہیں۔ انگلینڈ کے کسی شہر میں پیدا ہونے والا شخص پادریوں کے زیرِ اثر علاقوں میں منقسم، فطری طور پر خود کو سب سے زیادہ اپنے 'ہم پادری' والوں کے ساتھ وابستہ کرے گا (اس لیے کہ کئی معاملات میں ان کے مفادات مشترک ہوتے ہیں) اور 'پڑوسی' کے نام سے خود کو ممتاز کرے گا۔ اگر وہ اس کے گھر سے چند میل دور ملتا ہے تو وہ گلی کے تنگ خیال کو ترک کرے گا اور اُسے 'ہم شہر' کے نام سے سلام کرے گا۔ اگر وہ ملک سے باہر سفر کرتا ہے اور اُس سے کسی اور ملک میں ملتا ہے تو وہ گلی اور شہر کی معمولی تقسیم کو بھلا دیتا ہے اور اسے 'ہم وطن' کہہ کر پکارتا ہے۔ مگر اگر اپنے غیر ملکی دوروں میں وہ فرانس میں اکٹھے ہو جائیں، یا یورپ کے کسی دوسرے حصے میں تو ان کا مقامی تعارف 'انگلش مین' میں توسیع پاتا ہے۔ سارے یورپی، امریکہ کے اندر یا دنیا کے کسی بھی کونے میں ملتے ہیں تو وہ 'ہم وطن' بن جاتے ہیں۔ امتیازات براعظمی ذہن کے لوگوں کے لیے بہت زیادہ محدود ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس علاقے (پنسلوانیا) کی آبادی کا ایک تہائی حصہ بھی انگریز نسل سے نہیں ہے۔ اسی لیے میں، صرف انگلینڈ کے لیے والدین یا ماں ملک کے جملے کو جھوٹ، خود غرض، تنگ نظر اور کم ظرف سمجھتے ہوئے مسترد کرتا ہوں۔

لیکن، اگر یہ تسلیم کریں کہ ہم سب یورپی نسل سے ہیں تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ برطانیہ تو اب کھلا دشمن ہے، وہ ہر دوسرا نام اور لقب بجھا دیتا ہے۔ یہ کہنا کہ مفاہمت ہمارا فرض ہے، واقعی مضحکہ خیز ہے۔ انگلینڈ کے موجودہ سلسلے کا پہلا بادشاہ (ولیم دی کنکرر) ایک فرانسیسی تھا۔ اور انگلینڈ کے نوابوں کا نصف اُسی ملک کی آل اولاد ہیں۔ اس طرح، دلیل کے اسی طرز سے، تو انگلینڈ پر فرانس کو حکمرانی کرنی چاہیے۔

برطانیہ اور غلام امریکی علاقوں کی متحدہ قوت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ باہم مل کر وہ دنیا کو شکست دے سکتے ہیں۔ مگر یہ محض مفروضہ ہے، جنگ کی تقدیر غیر یقینی ہے، کہ

اظہار اور باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں، اس لیے کہ یہ کانٹی ننٹ ایشیا، افریقہ یا یورپ میں برطانوی فوجوں کی مدد کے لیے اپنے باشندوں کے بھیجے جانے کا دکھ کبھی نہیں سہے گا۔

مزید برآں ہمیں دنیا سے لڑنے سے کیا غرض؟۔ ہمارا منصوبہ تجارت ہے، اور اگر اچھی طرح توجہ دی جائے تو تجارت ہمیں سارے یورپ سے امن و دوستی عطا کرے گی، اس لیے کہ امریکہ کا ایک فری پورٹ ہونا سارے یورپ کے مفاد میں ہے۔ اس کی تجارت ہمیشہ اس کا دفاع، اور اس کی حفاظت بنے گی، اور سونے اور چاندی کا اس کا بانجھ پن اسے حملہ آور سے نجات دے گا۔

میں مفاہمت کے گرمجوش ترین حامی کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ برطانیہ سے تعلق رکھنے کا ایک بھی فائدہ بتا دے جو امریکہ کو ہو سکے۔ میں اپنا چیلنج دوہراتا ہوں، ایک بھی فائدہ نہیں ہے۔ ہماری مکئی یورپ کی کسی بھی منڈی میں اپنی قیمت لائے گی۔ اور درآمدی اشیا کے لیے ہمیں ادائیگی کرنا ہوگی، جہاں سے ہماری مرضی خریدیں۔

مگر اس تعلق سے ہم جو زخم اور نقصانات سہتے ہیں، وہ لاتعداد ہیں۔ وسیع طور پر بنی نوعِ انسان کے لیے، اور خود اپنے لیے ہمارا فرض ہمیں اس اتحاد کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لیے کہ برطانیہ کے ساتھ کوئی اطاعت یا اس پہ کوئی انحصار اس براعظم کو یورپی جنگوں جھگڑوں میں براہِ راست شامل کر دے گا، اور ہمیں اُن قوموں سے اختلاف میں ڈال دے گا جو ویسے ہماری دوستی چاہتی ہیں، اور جن کے خلاف نہ تو ہمیں کوئی ناراضگی ہے نہ کوئی شکایت۔ چونکہ یورپ تجارت کے لیے ہماری منڈی ہے، اس لیے ہمیں اس کے کسی حصے کے ساتھ کوئی جانب دارانہ تعلق نہیں بنانا چاہیے۔ یورپی جھگڑوں کو ختم کرنا غلام امریکہ کا اصل مفاد ہے، مگر وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ، برطانیہ پر اُس کے انحصار نے اُسے برطانوی سیاست کے پیمانے سے دیکھے جانے پر لگا دیا ہے۔

یورپ امن کی راہ پہ گامزن ہونے سے باز رہے گا، اس لیے کہ وہ بادشاہوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور جب بھی انگلینڈ اور کسی خارجی قوت کے بیچ جنگ چھڑ جاتی ہے، تو امریکہ کی تجارت برباد ہو جاتی ہے: 'وجہ برطانیہ سے اُس کا تعلق ہے'۔ ہو سکتا ہے اگلی جنگ پچھلی کی طرح نہ نکلے اور اسے ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مفاہمت کے طرف دار اُس وقت علیحدگی کی خواہش کریں گے، اس

لیے کہ اُس صورت میں غیر جانب داری، محفوظ تر دفاع ہوگی۔ ہر صحیح اور منطقی چیز، علیحدگی کی وکالت کرتی ہے، تہہ تیغ ہوئے کا خون اور، فطرت کی روتی ہوئی آواز فریاد کرتی ہے کہ ''یہ برطانیہ سے الگ ہونے کا وقت ہے''۔ حتیٰ کہ جس فاصلے پر خدا نے انگلینڈ اور امریکہ کو رکھا ہے وہ بھی ایک مضبوط اور فطری ثبوت ہے کہ ایک کی دوسرے پر اتھارٹی آسمان کی مرضی کبھی نہ تھی۔ اسی طرح جس وقت یہ براعظم دریافت ہوا، اس دلیل کا وزن بڑھ جاتا ہے، اور جس طریقے سے اسے انسانوں سے آباد کیا گیا، اُس دلیل کی قوت بڑھاتی ہے۔ 'اصلاح' امریکہ کی دریافت سے پہلے واقع ہوئی، گویا خدا، شان کے ساتھ مستقبل کے برسوں میں ایذا رسیدہ کے لیے ایک پناہ گاہ کھولنا چاہتا تھا، جب گھر نہ دوستی کا متحمل ہو نہ حفاظت کا۔

ان نو آبادیاتی ریاستوں پر برطانیہ کی اتھارٹی، حکومت کی ایک صورت ہے جس کا جلد یا بدیر خاتمہ یقینی ہے۔ اور کوئی بھی سنجیدہ دماغ سامنے دیکھ کر اس دردناک اور مثبت یقین کے تحت کوئی حقیقی مسرت نہیں اخذ کر سکتا کہ جسے وہ 'موجودہ آئین' کہتا ہے، محض عارضی ہے۔ والدین کے بطور، ہمیں یہ جانتے ہوئے کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ یہ حکومت کوئی ایسی چیز یقینی بنانے کے لیے کافی دیر تک چل نہیں سکتی جسے ہم آنے والی نسل کو ترکہ کر سکیں۔ اور دلیل کے ایک سادہ طریقے سے، جیسے کہ ہم اگلی نسل کو قرض میں ڈال رہے ہیں، اِس کا کام کرنا چاہیے۔ وگرنہ ہم اگلی نسلوں کو حقیر اور قابلِ ترس طور پر استعمال کریں گے۔ اپنے فریضے کی صحیح طور پر دریافت کرنے کے لیے، ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیے، اور اپنے قیامِ زندگی میں چند برس مزید متعین کرنے چاہئیں؛ تا کہ یہ وہ توقیر ایک امکان پیش کرے جسے چند موجودہ خوف اور تعصّبات ہماری آنکھوں سے چھپاتی ہیں۔

گو کہ میں غیر ضروری صدمہ دینے سے محتاط طور پہ پرہیز کروں گا، پھر بھی میں اس بات پہ بھروسہ کرنے پہ مائل ہوں کہ وہ سب لوگ جو مفاہمت کی وکالت کرتے ہیں، مندرجہ ذیل تشریحات میں شامل کیے جا سکتے ہیں: ذاتی مفاد رکھنے والے لوگ، جن پر بھروسہ نہ کیا جائے؛ کمزور لوگ جو دیکھ 'نہیں' سکتے؛ متعصب لوگ جو 'نہیں دیکھیں گے'؛ اور کچھ میانہ رو لوگ جو یورپی دنیا کو اُس سے

بہتر دیکھتے ہیں جس کا کہ وہ حق دار ہے، اور یہ آخری طبقہ بقیہ سارے تین کی بہ نسبت ایک کم فہم استدلال سے اس منطقے کو زیادہ مصیبتیں دے گا۔

موجودہ غم کی منظر گاہ سے دور رہنا بہت سوں کی خوش قسمتی ہے۔'انہیں' پُر خطر محسوس کرانے کے لیے برائی اُن کے دروازوں تک نہ لائی گئی جس سے کہ ساری امریکی جائیداد کو قابو کرلیا گیا ہے۔مگر آیئے چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات کو بوسٹن لے جائیں۔ بربادی کا وہ مرکز ہمیں ،بصیرت سکھا دے گا اور ہمیشہ کے لیے ہمیں ایک ایسی قوت کو ترک کرنے کی ہدایت دے گا جس پہ ہمیں کوئی اعتبار نہ ہوگا۔اُس بے بخت شہر کے باشندے جو صرف چند ماہ قبل امن میں تھے اور خوشحال تھے، اب اُن کے پاس سوائے زندہ رہنے اور فاقہ کرنے ، یا بھیک مانگنے کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اگر وہ اسی طرح شہر کے اندر رہتے ہیں تو اپنے دوستوں کی آگ سے خطرہ میں ہوں گے،اور اگر اسے چھوڑتے ہیں تو سپاہی انہیں لوٹتے ہیں۔اپنی موجود صورت حال میں وہ نجات کی امید کے بنا، قیدی ہیں۔اور اپنے ریلیف کے لیے ایک عمومی حملہ میں، وہ دونوں فوجوں کے غصے کے خطرے میں ہوں گے۔

غیر متحرک مزاج کے لوگ برطانیہ کی جارحیتوں کو بہت غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں۔اور ابھی تک اُس سے بہتری کی امید کرتے ہیں۔وہ یہ نعرہ لگانے میں لگے ہوئے ہیں،' آؤ، آؤ، ہم اس سب کے لیے دوبارہ دوست بن جائیں گے'۔مگر بنی نوع انسان کے جذبات اور احساسات کا جائزہ لو۔ مفاہمت کے ڈاکٹرائن کو'فطرت' کے معیار پر لاؤ، اور پھر مجھے بتاؤ کہ کیا تم اُس قوت سے محبت کر سکتے ہو،عزت کر سکتے ہو اور وفاداری سے اس کی بجا آوری کر سکتے ہو جو تمھاری سرزمین پر آگ اور خون لے آئی؟ ۔اگر تم ایسا نہیں کر سکتے ،تو پھر تم صرف خود کو دھوکہ دے رہے ہو،اور اپنی تاخیر سے، اپنی آل اولاد کے لیے تباہی لا رہے ہو۔ برطانیہ (جس سے تم نہ محبت کر سکتے ہو نہ عزت) کے ساتھ تمھارے مستقبل کا تعلق، زبردستی والا اور غیر فطری ہوگا۔ ماسوائے اُس وقت کے، جب تم یہ کہو، تم ابھی تک یہودیوں والا وہ عہد منا سکتے ہو جو اس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے کہ قہرِ ربانی فرشتہ کی صورت میں مصریوں پر نازل ہوا تھا۔اگر یہ کر سکتے ہو، تو پھر میں پوچھتا ہوں، کیا تمہارا گھر جلا دیا گیا ہے؟

۔کیا تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری جائیداد برباد کی گئی ؟۔کیا تمہاری بیوی بچے لیٹنے کے واسطے ایک بستر کے لیے، یا زندہ رہنے کے واسطے ایک روٹی کے لیے محتاج ہیں؟ کیا تم نے اُن کے ہاتھوں اپنا باپ یا ایک بچہ کھو دیا ہے، اور خود برباد و افتادِہ خاک زندہ بچے ہو؟ اگر نہیں، تو پھر تم ان لوگوں کے لیے کیسے جج بنتے ہو جو اُن قیامتوں میں سے گزرے ہیں؟۔لیکن اگر تم نے یہ بھگتے ہیں، او ر ابھی تک قاتلوں سے ہاتھ ملا سکتے ہو، تو پھر تم ایک خاوند، باپ، دوست، یا محبوب کے نام کے لائق نہیں ہو، اور زندگی میں خواہ تمہارا جو بھی عہدہ یا مقام ہو تمہارے پاس ایک ڈرپوک دل، اور ایک چاپلوس روح ہے۔

یہ معاملات کو بھڑکانے یا بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی بات نہیں ہے بلکہ انہیں اُن احساسات اور محبتوں سے دیکھنے کی بات ہے جنہیں فطرت جواز فراہم کرتی ہے، اور جن کے بغیر ہم زندگی کے سماجی فرائض ادا کرنے یا اس کی نعمتوں کا لطف اٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔میرا مطلب انتقام ابھارنے کے مقصد کے لیے دہشت دکھانا نہیں ہے، بلکہ ہمیں مہلک اور بزدلانہ خواب سے جگانا ہے، تاکہ ہم کسی معین مقصد کا مصمم انداز میں پیچھا کر سکیں۔امریکہ کو فتح کرنا برطانیہ یا یورپ کے بس میں نہیں ہے، بشرطیکہ وہ تاخیر اور بزدلی سے خود کو فتح نہ کر لے۔موجودہ سرما اگر صحیح استعمال ہو تو یہ ایک پورے عہد کی قیمت کا ہوگا۔مگر اگر اسے ضایع کیا گیا یا نظر انداز کیا گیا تو سارا کانٹی نینٹ اس بدقسمتی کا پیالہ پیے گا۔اور کوئی سزا نہیں جس کا وہ مستحق نہ ہو، وہ خواہ جو بھی، جیسا بھی ہو، کیا بھی ہو اور کہاں بھی ہو، جو اس قدر قیمتی اور مفید موسم کو قربان کرنے کا وسیلہ بنے۔

یہ فرض کرنا دلیل اور چیزوں کے عالم گیر نظام اور سابقہ زمانوں سے ساری مثالوں کے متضاد ہوگا، کہ امریکہ دیر تک کسی خارجی طاقت کا غلام رہے گا۔ برطانیہ کا سرگرم ترین شخص بھی ایسا نہیں سوچتا۔اس موقع پر انسانی بصیرت کا انتہائی پھیلاؤ علیحدگی سے کم کے کسی منصوبے کا احاطہ نہیں کر سکتا، جو کہ غلام امریکہ کو ایک سال کی بھی سلامتی کی ضمانت دے سکتا ہو۔مفاہمت 'اب' ایک گمراہ کن خواب ہے۔قدرت نے رشتہ کو مسترد کیا ہے، اور آرٹ اسے مقام مہیا نہیں کر سکے گا۔اس لیے کہ جیسے کہ دانا ملٹن نے کہا کہ 'وہاں صحیح مفاہمت کبھی نہیں اگ سکتی جہاں مہلک نفرت کے زخم اس قدر

گہرائی میں پہنچ چکے ہوں۔

امن کے لیے ہر خاموش طریقہ غیر مؤثر ہو چکا ہے۔ ہماری دعائیں حقارت کے ساتھ مسترد کی جا چکی ہیں اور ہمیں اس بات پہ قائل کرنے کے لیے مائل کر چکیں کہ بار بار درخواستیں کرنے سے زیادہ کوئی اور چیز بادشاہوں میں خودنمائی اور ضد و کبر پیدا نہیں کرتیں......اور اسی بات نے یورپ کے بادشاہوں کو مطلق العنان بنا دیا۔سویڈن اور ڈنمارک اُس کی مثالیں ہیں۔ چونکہ ضربوں اور مکوں کے بغیر کسی اور چیز سے بات نہیں بنتی، اس لیے خدا کے واسطے آؤ ہم ایک آخری علیحدگی پہ آ جائیں اور والدین اور بچے جیسے بے عصمت اور بے معنی ناموں کے تحت اپنی اگلی نسل کے گلے کاٹنے نہ دیں۔

یہ کہنا کہ وہ آئندہ اس کی کوشش کبھی نہیں کریں گے مجہول اور خام خیالی ہے۔ ہم نے 'سٹیمپ ایکٹ' کی تنسیخ پر ایسا سوچا تھا۔مگر ایک یا دو سال نے ہمیں فریب سے باہر نکال دیا تھا۔مزید برآں کیا ہم یہ فرض کر لیں کہ جو قومیں ایک بار شکست کھا چکی ہیں، دوبارہ کبھی جنگ شروع نہیں کریں گی؟!۔

جہاں تک حکومتی معاملات کا تعلق ہے، یہ برطانیہ کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کانٹی ننٹ کو انصاف دے۔اس کا کام بہت جلد اس قدر زیادہ وزن دار اور پیچیدہ ہو جائے گا کہ وہ کام 'کسی ایسی طاقت' کے ذریعے کسی بھی قابلِ برداشت سطح کی آسانی سے چلایا نہیں جا سکے گا جو ہم سے اس قدر دور اور ہم سے اس قدر بے خبر ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہمیں فتح نہیں کر سکتے تو وہ ہم پہ حکومت نہیں کر سکتے۔ایک خبر یا درخواست کے ساتھ ہمیشہ تین چار ہزار میل بھاگتے رہنا، ایک جواب کے لیے چار پانچ ماہ انتظار کرتے رہنا، جو جب وصول بھی ہو جائے، تب تشریح کے لیے مزید پانچ چھ ماہ چاہیے ہوتے ہیں۔ چند ہی سالوں میں ایک حماقت اور بچگانہ عمل معلوم ہوگا۔ایک وقت تھا جب یہ مناسب تھا اور اب یہ مناسب وقت ہے کہ یہ ختم ہو جائے۔

خود کو محفوظ رکھنے کے قابل نہ ہونے والے چھوٹے جزائر کو اپنی حفاظت میں رکھنا بادشاہوں کے اصل مقصد ہوتے ہیں، مگر ایک جزیرے کی طرف سے ایک پورے براعظم پر دائمی طور پر حکومت کرنا ایک بے ہودہ تصور ہے۔کسی بھی موقع پر فطرت نے ایک جرم کو اپنے بنیادی سیارے

سے زیادہ وسیع نہیں بنایا۔انگلینڈ اور امریکہ کا ایک دوسرے سے تعلق، فطرت کے عمومی نظام کے برعکس ہے۔ظاہر ہے کہ وہ مختلف نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔انگلینڈ یورپ کے نظام سے تعلق رکھتا ہے اور، امریکہ اپنے نظام سے۔

میں غرور، گروہ یا خفگی کی محرکات کی وجہ سے علیحدگی اور آزادی کی حمایت کرنے پر مائل نہیں ہوا ہوں۔ میں واضح، مثبت اور شعوری طور پر راغب ہوں کہ ایسا ہونا اِس غلام امریکہ کے مفاد میں ہے۔'اِس سے' کم ہر بات محض پیوندکاری ہے......ایسا کرنا اپنے بچوں پر تلوار گرانا ہے، اور ایک ایسے وقت پیچھے سکڑ جانا ہے جب ذرا آگے اس خطے کو دنیا کی عظمت عطا ہوتی۔

برطانیہ نے مصالحت کی طرف معمولی جھکاؤ کا بھی اظہار نہیں کیا۔ہمیں یقین ہوتا ہے کہ غلام امریکہ کو قبول ہونے کے قابل کوئی شرائط' حاصل نہیں کی جا سکتیں، یا اُن خون اور خزانے کی قیمت کے برابر کوئی چیز حاصل نہیں کی جا سکتی جو ہمیں پہلے ہی ادا کرنا پڑی۔

غرض، جس چیز کے لیے جدوجہد کی جائے اسے خرچ کے عین تناسب میں ہونا چاہیے۔

'شمال' کا ہٹایا جانا یا ساری مکروہ سازشی جماعت کی معزولی ایک بے وقعت معاملہ ہے جس کے لیے ہم نے ہمیشہ ملینوں خرچ کر دیے۔تجارت کو عارضی روک دینا ایک نامناسب بات تھی جس نے شکایت کردہ سارے اقدامات کی تنسیخ کا اچھا خاصا توازن کرنا تھا، اگر اس طرح کی تنسیخیں حاصل ہوتیں۔لیکن اگر سارا غلام امریکہ اسلحہ اٹھائے، اگر ہر شخص ایک سپاہی بن جائے تو یہ محض ایک حقیر وزارت کے خلاف لڑائی کے ہمارے وقت کے برابر بھی نہ ہوگا۔اقدامات کی تنسیخ کے لیے ہم بھاری قیمت دیتے ہیں، اگر ہم صرف اس چیز کے لیے لڑتے ہیں، اس لیے کہ، ایک منصفانہ اندازے کے مطابق یہ زمین کے لیے ایک 'بنکر پہاڑی' کی قیمت دینے جیسی عظیم غلطی ہے۔جیسا کہ میں نے ہمیشہ اس کانٹی ننٹ کی آزادی کو ایسا سمجھا ہے جو جلد یا بدیر ضرور حاصل ہوگی، اس لیے بلوغت کی طرف کانٹی ننٹ کی دیر سے تیز رفتار پراگریس سے، یہ زیادہ دور نہ ہوگی۔مہلک 19 اپریل 1775 سے قبل، مفاہمت کے لیے مجھ سے زیادہ کوئی اور گرم جوش خواہش مند نہ تھا مگر جس لمحے اُس روز کا واقعہ کیا گیا، میں نے انگلینڈ کے سخت ہوتے ہوئے ضدی مزاج فرعون کو ہمیشہ کے لیے مسترد

دکر دیا، اور پاجی کو حقارت سے دیکھا۔ وہ اپنی 'قوم کا باپ' کے دکھاوے والے لقب کے ساتھ ان کے ذبیحہ کو بے حسی سے سن سکتا ہے، اور اُن کے خون کا ذمہ دار اپنی روح کو قرار دینے کے باوجود اطمینان کے ساتھ سو سکتا ہے۔

ہماری ایک اپنی حکومت ہمارا فطری حق ہے، اور جب کوئی شخص انسانی معاملات کے غیر معین ہونے پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے، تو وہ قائل ہو جائے گا کہ ایک ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ سمجھ کر خود اپنا ایک آئین بنانا بہت ہوش مندی ہے، جسے ہم اپنی طاقت میں رکھتے ہوں، بہ نسبت اس طرح کے دلچسپ واقعہ کے لیے وقت اور تقدیر پر اعتبار کرنے کے۔ اگر ہم اب اسے غفلت سے ترک کر دیں گے تو بعد میں کوئی 'ماسانیلو' اٹھ سکتا ہے، جو بے چین لوگوں میں مقبولیت حاصل کر کے، پریشان اور ناخوش لوگوں کو اکٹھا کرے، اور انہیں اقتدار کا مالک فرض کروا کر، اور آخر کار ایک سیلاب کی طرح امریکہ کی آزادیوں پر جھاڑو پھیر دے۔ اگر امریکہ کی حکومت دوبارہ برطانیہ کے ہاتھوں میں چلی جائے، تو چیزوں کی لڑکھڑاتی صورتِ حال کسی من چلے مہم پسند کے لیے قسمت آزمائی کی ایک ترغیب ہو گی۔ اور ایک ایسی صورت حال میں برطانیہ کیا مدد دے سکتا ہے؟ قبل اس کے کہ برطانیہ تک یہ خبر پہنچے، مہلک وار ہو چکا ہو گا اور اس فاتح کا استبداد برطانویوں کے استبداد کی طرح ہمیں ہی جھیلنا ہو گا۔ تم میں سے وہ جو، اب آزادی کی مخالفت کرتے ہو، تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ حکومت کی کرسی خالی چھوڑ کر دائمی ظلم و استبداد کا ایک دروازہ کھول رہے ہو۔ ہزاروں لاکھوں ایسے ہیں جو اُس بربر اور جہنمی طاقت کو غلام امریکہ سے نکال باہر کرنے کو عظیم الشان سمجھتے ہیں جس نے کہ ہمیں تباہ کرنے کے لیے انڈینز اور نیگروز کو بھڑکایا۔ اس ظلم کی دگنی پشیمانی ہے، یہ ہماری طرف سے ظالمانہ معاملہ کر رہا ہے، اور اُن کی طرف سے غدارانہ۔

اُن لوگوں کے ساتھ دوستی کی بات پاگل پن اور احمقی ہے، جن لوگوں پر ہماری دلیل یقین کرنے سے ہمیں منع کرتی ہے، اور ہزاروں مساموں سے زخمی کردہ ہماری محبتیں ہمیں سخت نفرت کرنے کی ہدایت کرتی ہیں۔ ہر نیا دن، اُن کے اور ہمارے بیچ قرابت کے کم باقی بچے ہوئے فاصلے کو مزید کم کرتا جاتا ہے اور کیا امید کرنے کی کوئی دلیل ہو سکتی ہے، کہ جیسے تعلق ختم ہو جاتا ہے چاہت

بڑھ جائے گی۔ یا یہ کہ ہم بہتر طور پر رضامند ہو جائیں گے جب ہمارے پاس جھگڑے کے لیے ہمیشہ سے دس گنا بڑے معاملات ہوں؟۔

تم جو ہمیں مصالحت اور ہم آہنگی کا درس دیتے ہو، کیا تم ہمیں وہ وقت واپس کر سکو گے جو گزر گیا؟۔ کیا تم رنڈی کو اُس کی سابقہ معصومیت دے سکتے ہو؟۔ اسی طرح تم برطانیہ اور امریکہ میں صلح نہیں کرا سکتے ہو۔ آخری ڈور اب ٹوٹ چکی ہے۔ ایسے زخم ہوتے ہیں جنہیں فطرت معاف نہیں کر سکتی۔ اگر وہ معاف کرے تو وہ فطرت نہیں رہ جاتی۔ کیا عاشق اپنی محبوبہ کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والے کو معاف کر سکتا ہے؟۔ اسی طرح غلام امریکہ، برطانیہ کے قتل کو معاف نہیں کر سکتا۔ خدا نے ہمارے اندر اچھے اور عقل مند مقاصد کے لیے یہ نہ بجھائے جا سکنے والے احساسات اُگا رکھے ہیں۔ یہ ہمارے دلوں میں اس کی شبیہہ کے محافظ ہیں۔ یہ ہمیں عام جانوروں کے ریوڑوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ اگر ہم محبت کے احساسات کے لیے بے حس ہوتے تو انصاف روئے زمین سے مکمل طور پر ختم ہو جاتا یا محض ایک اتفاقیہ وجود رکھتا۔ اگر ہمارے مزاجوں پہ لگے زخم ہمیں انصاف پر نہ اکساتے تو ڈاکو اور قاتل بغیر سزا کے بچ جاتے۔

او! تم جو انسانیت سے پیار کرتے ہو! تم جو نہ صرف آمریت بلکہ آمر کی مخالفت کی جرأت کرتے ہو، ثابت قدم رہو!۔ پرانی دنیا کا ہر نقطہ استبداد سے زخمی زخمی ہے۔ آزادی کو پورے کرۂ ارض کے گرداگرد شکار کیا گیا ہے۔ ایشیا اور افریقہ نے عرصہ ہوا اُسے نکال باہر کر دیا۔ یورپ اسے اجنبی سمجھتا ہے اور انگلینڈ نے اسے روانگی کا نوٹس دے دیا ہے۔ او! پناہ گیر کو وصول کر، اور وقت پر بنی نوعِ انسان کے لیے ایک پناہ گاہ تیار کر!۔

امریکہ کی موجودہ صلاحیت پر

مجھے نہ تو انگلینڈ اور نہ امریکہ میں کوئی ایسا شخص ملا جس نے یہ اعتراف نہ کیا ہو کہ ان دونوں ملکوں میں کسی نہ کسی وقت علیحدگی ضرور ہو گی۔ اور ایسا کوئی موقع نہیں جس میں ہم نے یہ بیان کرنے کی کوشش سے کم بات کی ہو کہ اِن نو آبادیوں کے آزاد ہو جانے کے لیے پک جانے یا

موزوں ہو جانے کا وقت آ گیا ہے۔

سب انسان اس کی اجازت دیتے ہیں، اور صرف وقت سے متعلق ایک دوسرے سے مختلف رائے دیتے ہیں۔ تو آیئے غلطیوں کو دور کرنے کے لیے چیزوں کا عمومی جائزہ لیں۔ اور اگر ممکن ہو تو ٹھیک وقت کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ مگر ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں، تحقیق یک دم ختم ہو جاتی ہے اس لیے کہ 'وقت نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے'۔ ایک عمومی ہم وقتی، ساری چیزوں کے شاندار اتحاد کی حقیقت کو ثابت کرتی ہے۔

ہماری قوت، تعداد میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔ پھر بھی ہماری موجودہ تعداد پوری دنیا کی طاقت کے دھکیلنے کو کافی ہے۔ ہمارے غلام علاقوں کے پاس اس وقت روئے زمین پر موجود سب سے بڑی مسلح اور نظم وضبط والی فوج موجود ہے۔ اور وہ ابھی ابھی طاقت کے اُس نقطے پر پہنچی ہے، جس میں کوئی واحد نو آبادی اکیلی خود کو بچا نہیں سکتی، اور پورا مجموعہ، جب متحد ہو تو یہ کام کر سکتا ہے۔ ہماری زمینی فوج پہلے ہی کافی ہے، اور جہاں تک بحری معاملات کا تعلق ہے تو ہم اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے کہ جب تک کہ یہ وطن اُس کے کنٹرول میں رہتا ہے، برطانیہ ایک امریکی جنگی قوت کی تعمیر کو کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے ہمیں اس شعبے میں ایک سو سال تک ایسے ہی رہنا ہے۔

اگر یہ غلام علاقہ باشندوں سے پر ہجوم ہوتا، تو موجودہ حالات میں اس کی مصیبتیں ناقابلِ برداشت ہوتیں۔ ہمارے پاس جتنے زیادہ بندرگاہی شہر ہوتے اتنے زیادہ کا ہمیں دفاع کرنا، اور اُن سے دست بردار ہونا پڑتا۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری موجودہ تعداد ہماری ضرورتوں کے اس قدر مطابق ہے، کہ کسی شخص کو بے کار ہونے کی ضرورت نہیں۔ تجارت کی کمی ایک فوج کی متحمل ہو سکتی ہے ، اور ایک آرمی کی ضروریات ایک نئی تجارت پیدا کرتی ہیں۔

ہم پہ قرضے نہیں ہیں، اور جو کچھ ہم اس مد میں حاصل کر سکیں گے، وہ ہماری شاندار بہبود کے بطور کام آئے گا۔ اگر ہم اگلی نسل کو حکومت کی ایک پرسکون صورت دے پائیں، جس کا اپنا ایک آزاد آئین ہو، تو یہ ہر قیمت پر سستی بات ہوگی۔ مگر محض چند حقیر اقدامات کو منسوخ کرانے، اور محض

موجودہ وزارت کو درہم برہم کرنے کے لیے ملینوں خرچ کرنا، قربانی کے شایانِ شان نہیں ہے، اور یہ گویا اگلی نسل کو تقریباً ظالمانہ استعمال کرنا ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اُن کے لیے بہت سارا کام چھوڑنے کے مترادف ہوگا۔ اور ان کی پیٹھ پر بھاری قرضہ لادنا ہوگا جس سے وہ کوئی فائدہ نہ اٹھائیں گے۔ ایسا خیال ایک باوقار آدمی کے شایانِ شان نہیں ہے، اور یہ ایک غیر اہم سیاستدان اور ایک تنگ ،دل کی خاصیت ہے۔

جو قرض ہم حاصل کریں وہ ہماری عزت کا مستحق نہیں ہوگا اگر کام مکمل نہ ہو۔ کوئی قوم قرض کے بغیر نہیں رہتی۔ ایک قومی قرض قومی بانڈ ہوتا ہے اور جب اس پر کوئی سود نہ ہو، تو یہ کسی طرح بھی بوجھ ورنج نہیں ہے۔ برطانیہ ایک سو چالیس ملین سٹرلنگ سے زائد کے قرضے میں جکڑا ہوا ہے جس پر وہ چار ملین سے زائد کا سود دیتا ہے۔ اور اپنے قرض کی تلافی میں، اُس کے پاس ایک وسیع نیوی ہے۔ غلام امریکہ قرض کے بغیر ہے اور ایک نیوی کے بغیر ہے، پھر بھی انگلینڈ کے قومی قرضے کے بیسویں حصے پر دوبارہ اتنی بڑی نیوی رکھ سکتا ہے۔

امریکہ کو نو آبادیوں کی نوزائیدہ ریاست کہا جاتا ہے، یہ آزادی کے حق میں ایک دلیل ہے۔ ہم کافی زیادہ تھے، اور اگر ہم اس طرح ہوتے بھی تو کم متحد ہوتے۔ یہ بات بالمشاہدہ کرنے کے قابل ہے کہ ایک ملک جتنا زیادہ گنجان آباد ہو، اتنی ہی اس کی افواج کم ہوں گی۔ فوجی تعداد میں، قدیم جدیدوں سے بہت زیادہ تھے۔ اور وجہ صاف ہے۔ اس لیے کہ تجارت آبادی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے لوگ کسی اور چیز کی طرف توجہ دینے میں فارغ نہ تھے۔ کامرس، حب الوطنی اور فوجی دفاع دونوں کی روح کو کم کر دیتی ہے۔ اور تاریخ ہمیں اچھی طرح بتاتی ہے کہ بہادر ترین حاصلات ہمیشہ ایک قوم کی کم سنی میں کی گئیں۔ تجارت میں اضافہ کے ساتھ انگلینڈ اپنی روح کھو گیا۔ لندن شہر، اپنی تعداد کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے ایک بزدلی والے صبر کے ساتھ توہینوں کا فرماں بردار ہے۔ لوگوں کو جتنا زیادہ نقصان کرنا پڑے، وہ اتنا ہی سرمایہ کاری کرنے پر کم رضا مند ہوتے ہیں۔ امیر عمومی طور پر خوف کے غلام ہوتے ہیں، اور خوشامدی انداز میں طاقت کے سامنے ایک کتے کے کپکپاتے دوغلے پن کے ساتھ اطاعت گزار ہوتے ہیں۔

جوانی، اچھی عادتوں کی کاشت کا زمانہ ہوتی ہے، فرد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی۔اب سے نصف صدی بعد غلام امریکہ کے لیے ایک حکومت بنانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوسکتا ہے۔مفادات کی وسیع تنوع، تجارت اور آبادی میں اضافہ سے مل کر کنفیوژن پیدا کرسکتی ہے۔ ایک غلام علاقہ دوسرے غلام علاقہ کے خلاف ہوگا۔ ہرایک اہل ہوتے ہوئے بھی دوسرے کی مدد نہیں کرے گا۔اور جب مغرور واحمق اپنے چھوٹے امتیازات پر فخر کریں، تب عقل منداس بات پر ماتم کریں گے کہ یونین پہلے کیوں نہیں بنائی گئی۔اس لیے موجودہ وقت اُسے قایم کرنے کا صحیح وقت ہے۔کم سنی کی ساتھی گیری، اور بدقسمتی میں بنی ہوئی دوستی، سب سے زیادہ دیرپا اور ناقابلِ تغیر ہوتی ہیں۔ ہمارا موجودہ یونین ان دونوں خصوصیات سے مزین ہے۔ ہم جوان ہیں، اور ہم بے آرام رہے ہیں، مگر ہمارا اتحاد ہمارے مصائب کو جھیل گیا، اور اس نے آنے والی نسلوں کے لیے اس پر ناز کرنے کو ایک یادگار عہد معین کیا ہے۔

موجودہ زمانہ وہ خاص زمانہ ہے جو قوموں میں صرف ایک بار آتا ہے۔یعنی اپنی ایک حکومت بنانے کا وقت۔ بہت ساری قوموں نے یہ وقت پھسلنے دیا، اور یوں وہ اپنے لیے خود قوانین بنانے کے بجائے اپنے فاتحوں کی طرف سے قوانین وصول کرنے پر مجبور ہوئے۔ پہلے، ان کا ایک بادشاہ تھا، اُس کے بعد ایک حکومتی قسم۔حالانکہ ایک حکومت کا چارٹر یا اُس کی آئینی شقیں پہلے بنانا چاہئیں، اور ان پر عمل درآمد کروانے والے لوگ بعد میں مقرر ہونے چاہئیں۔مگر آیئے دوسری قوموں کی غلطیوں سے سیکھیں اور اِس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں......آیئے ہم صحیح وقت پر حکومت شروع کریں۔

جب ولیم دی کنکرر نے انگلینڈ کو زیر کرلیا، تو اس نے انہیں تلوار کی نوک پر قانون دے دیا۔اور جب تک ہم یہ رضامندی نہ دیں کہ امریکہ میں حکومت قانونی طور پر بن جائے، ہم کسی طالع آزما غنڈے کے اُس پر بیٹھ جانے کے خطرے میں ہوں گے۔جو کہ ہم سے اُسی طریقے سے سلوک کرے گا۔اور پھر، ہماری آزادی کہاں ہوگی؟۔ ہماری جائیداد کہاں ہوگی؟۔

پچھلے صفحے پر میں نے غلام امریکہ کے چارٹر کی معقولیت پر کچھ خیالات پیش کیے تھے۔

اور یہاں میں اُس موضوع کو دوبارہ چھیڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ میں نے مشاہدہ کیا کہ ایک چارٹر کو متین ذمہ داری کے ایک ضامن کے بطور سمجھنا چاہیے۔جو کہ سب کا سب بتاتا ہے، یعنی ہر الگ حصے کے حق کی حمایت کرنا، خواہ وہ مذہب ہو، پیشے یا جائیداد کی آزادی ہو۔ایک درست حساب کتاب دیرپا دوست بناتا ہے۔

اسی طرح میں نے پچھلے صفحات میں ایک وسیع اور مساوی نمائندگی کی ضرورت کا ذکر بھی کیا۔اس سے بڑھ کر کوئی اور سیاسی معاملہ ہماری توجہ کا مستحق نہیں ہوگا۔ ووٹ دینے والوں کی ایک چھوٹی تعداد، یا نمائندوں کی ایک چھوٹی تعداد، دونوں مساوی طور پر خطرناک ہیں۔مگر اگر نمائندوں کی تعداد چھوٹی کے علاوہ، غیر مساوی بھی ہو، تو خطرہ مزید بڑھ جاتا ہے۔

فوری لزومیت بہت سی چیزوں کو آسان بناتی ہے۔لیکن اگر باتوں کو طول دیا جائے تو وہ مظالم میں تبدیل ہوسکتی ہیں۔تدبیر اور حق مختلف چیزیں ہیں۔ جب امریکہ کی آفتوں کو ایک مشاورت کی ضرورت تھی، تو اُس وقت، کوئی اور طرز اس قدر تیار، یا مناسب نہ تھا جس طرح کہ اسمبلی کے ایوانوں میں سے اشخاص کا مقرر کیا جانا موزوں اور مناسب تھا۔ اور جس بصیرت کے ساتھ انہوں نے کام شروع کیا اُس نے اس کانٹی ننٹ کو بربادی سے بچالیا۔مگر چونکہ یہ ممکنات سے زیادہ ہے کہ ہم ایک 'کانگریس' کے بغیر کبھی نہ ہوں گے، اچھے نظام کے ہر خیر خواہ کے لیے اس بات کا مالک ہونا ضروری ہے کہ اس تنظیم کے ممبروں کو چننے کا طریقہ بہت اچھا ہو۔اور میں اسے ایک سوال کے بطور اُن لوگوں کو پیش کرتا ہوں جو بنی نوعِ انسان کا مطالعہ کرتے ہیں: کیا نمائندگی اور الیکشن ایک بہت بڑی قوت نہیں ہے؟۔جب ہم اگلی نسلوں کے لیے منصوبہ بندی کررہے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی موروثی نہیں ہوتی۔

یہ بات کچھ لوگوں کے لیے حیران کن ہوسکتی ہے، یا اس طرح سوچنے میں بہت سے لوگ نارضامند ہوں گے، مگر یہ اہمیت نہیں رکھتا۔لیکن یہ دکھانے کے لیے بہت سے مضبوط دلائل دیے جاسکتے ہیں کہ ایک کھلے عام اور مصمم 'آزادی کے لیے اعلان نامہ' سے زیادہ کوئی اور چیز ہمارے معاملات کو اس قدر مستعدی سے حل نہیں کرسکتی۔ان دلائل میں سے کچھ یہ ہیں:

اول: قوموں کی خصلت ہے کہ جب دو قومیں دوسری طاقتوں کے لیے جنگ میں ہوں، تو وہی طاقتیں مصالحت کنندہ کے بطور آجاتی ہیں، اور ایک امن کے ابتدائی انتظامات لاتی ہیں۔ مگر یہاں، جب کہ امریکہ خود کو برطانیہ کی رعیت کہلواتا ہے تو کوئی طاقت، خواہ وہ کتنی بھی منظّم کیوں نہ ہو اپنی مصالحت کاری کی پیش کش نہیں کرسکتی۔ اس لیے، ہماری موجودہ حالت میں ہم ہمیشہ کے لیے لڑتے رہیں گے۔

دوم: یہ سوچنا بلا جواز ہے کہ فرانس یا سپین ہمیں کسی طرح کی امداد دیں گے، اگر ہم اس امداد کو صرف برطانیہ اور امریکہ کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے اور شگاف کی مرمت کے مقصد کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ اس لیے کہ نتیجے میں وہ طاقتیں تکلیف میں ہوں گی۔

سوم: جبکہ ہم برطانیہ کی رعایا ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، اور پھر اُس کے خلاف لڑتے ہیں تو ہم خارجی اقوام کی نظروں میں باغی تصور ہوں گے۔ یہ نظیر اُن کے سکون و امن کے لیے کسی قدر خطرناک ہے، یعنی رعایا کے نام کے تحت لوگوں کا ہتھیار اٹھالینا۔ ہم، اسی جگہ خلافِ قیاس بات کو حل کرسکتے ہیں، مگر مزاحمت اور اطاعت کو اکٹھا کرنے کی بات کو عام تفہیم دلانے کے لیے بہت زیادہ شائستہ خیال کی ضرورت ہوتی ہے۔

چہارم: اگر ایک منشور و مینی فیسٹو چھاپا جاتا اور خارجی ملکوں کو بھیجا جاتا، جس میں ان مصائب کو پیش کیا جاتا جو ہم نے سہی ہیں، اور وہ پر امن ذرائع کی تفصیل ہوتی جو ہم نے بہتری کے لیے بغیر اثر کے استعمال کیے، نیز، یہ اعلان بھی کیا جاتا کہ برطانوی دربار کے ظلم و جبر کے تحت مسرور اور محفوظ رہنے کے قابل نہ رہتے ہوئے، ہم اس کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات توڑنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ بہ یک وقت سارے ایسے ملکوں کی طرف اپنے پر امن رجحان کی یقین دہانی کراتے، اور ان کے ساتھ تجارت شروع کرنے کی اپنی خواہش ظاہر کرتے۔ اس طرح کی ایک عرض داشت غلام امریکہ کے لیے زیادہ اچھے اثرات پیدا کرے گی، بہ نسبت برطانیہ کو اپیلوں کا ایک پورا بحری جہاز بھر کر بھیجے جانے سے۔

برطانوی رعایا ہونے کے سبب ہم باہر نہ تو سنے جاتے ہیں نہ خیر مقدم کیے جاتے ہیں۔

تمام درباروں کا برتاؤ ہمارے خلاف ہے، اور خلاف ہی رہے گا جب تک کہ ایک آزادی کے حصول سے ہم دوسری قوموں کی صفوں میں کھڑے نہیں ہوتے۔

یہ کارروائیاں پہلے پہل عجیب اور مشکل لگتی ہوں گی، مگر یہ، تھوڑے ہی وقت میں شناسا اور قابلِ رضامندی ہوجائیں گی۔ اور جب تک ایک آزادی کا اعلان نہ ہوگا، غلام امریکہ خود کو ایک ایسے شخص کی طرح محسوس کرے گا جو روز بہ روز کوئی ناخوشگوار معاملہ ملتوی کرتا رہا ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُسے کرنا ضرور ہے وہ اُسے کر گزرنے سے نفرت کرتا ہے، اس کی آرزو کرتا ہے، اور اس کی لزومیت کی سوچوں کے مسلسل تعاقب کی زد میں ہوتا ہے۔

****

کامن سینس کا ضمیمہ

اس پمفلٹ کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت، یا بلکہ، اُسی دن جب یہ چھپ کر آیا، بادشاہ کی تقریر اِس شہر (فلیڈیلفیا) میں نمودار ہوئی۔ اگر پیش گوئی کی روح اس تقریر کی پیدائش کی راہنمائی کرتی، تو یا اسے سامنے نہ لاتی، یا اُسے ایک زیادہ برمحل موقع، یا ایک زیادہ ضروری وقت پہ سامنے لاتی۔ ایک کی خونی ذہنیت دوسرے کی ڈاکٹرائن کو جاری رکھنے کی نمائش کرتی ہے۔ لوگ انتقام کے حوالے سے پڑھتے ہیں۔ اور تقریر نے بجائے خوفزدہ کرنے کے، آزادی کے مردانہ اصولوں کے لیے ایک راستہ تیار کیا۔

جشن کا ایک تکلیف دہ پہلو ہوتا ہے جب وہ کمینہ اور مکار کارکردگی کو حمایت کی نچلی ترین سطح دیتے ہیں۔ بادشاہ کی تقریر، ایک مزین بدمعاشی کا ٹکڑا ہوتے ہوئے، ایک عمومی نفرت کی مستحق تھی اور اب بھی ہے، کانگریس کی طرف سے بھی اور عوام کی طرف سے بھی۔ پھر بھی جیسے کہ ایک قوم کا داخلی امن زیادہ تر 'پاک دامنی' (جس کو مناسب الفاظ میں 'قومی رسوم' کہا جاسکتا ہے) پر منحصر ہوتا ہے، تو کچھ چیزوں کو ایک خاموش حقارت میں گزر جانے دینا اکثر بہتر ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ ناپسندیدگی کے اس طرح کے نئے طریقوں کو استعمال کیا جائے جو ہمارے امن اور سلامتی کے اُس محافظ پر

کم سے کم جدت و اختراع کو متعارف کرائیں...... یہ تقریر (اگر اسے ایک تقریر کہا جائے تو)، سچ، مشترک بہتری اور بنی نوعِ انسان کے وجود کے خلاف ایک بے ادب دانستہ ہتک کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور یہ انسانی قربانیوں کو جابروں کے گھمنڈ کو پیش کرنے کا ایک باضابطہ اور پرشکوہ طریقہ ہے۔مگر انسانوں کا یہ عمومی قتلِ عام بادشاہوں کے استحقاقوں اور یقینی نتیجوں میں سے ایک ہے، اس لیے کہ چونکہ قدرت 'انھیں نہیں' جانتی، وہ 'قدرت کو نہیں' جانتے، اور گو کہ وہ ہمارے 'اپنے' پیدا کردہ ہیں، وہ 'ہمیں' نہیں جانتے اور اپنے خالقوں کے خدا بن چکے ہیں۔ اس تقریر کی ایک اچھی صفت یہ ہے کہ وہ دھوکہ نہیں دے سکتی، نہ ہی ہم دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ بربریت اور استبداد اُس کے چہرے سے ظاہر ہے۔ یہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتی، اور ہر سطر پڑھنے کے وقت قائل کرتی ہے کہ جو شخص ننگے اور اَن سدھائے انڈینز کو شکار کرنے کے لیے جنگلات کو شکار کرتا ہے، وہ شخص بھی برطانیہ کے بادشاہ سے کم ظالم و بربر ہے۔

البتہ اس بات سے اب فرق نہیں پڑتا کہ بادشاہ کیا کہتا ہے یا کیا کرتا ہے۔ اس نے مکاری کے ساتھ ہر اخلاقی اور انسانی ذمہ داری توڑ ڈالی۔ فطرت اور ضمیر کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا اور توہین اور ظلم کی ایک مستقل اور دستوری روح سے اپنے لیے ایک عالم گیر نفرت کما لی۔ 'اب' یہ امریکہ کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے لیے ہی پیداوار کرے۔

امریکہ کی موجودہ حالت ہر اُس شخص کے لیے تشویش ناک ہے جو سوچنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ موجودہ حالت کی حقیقت یہ ہے: بغیر قانون کے، بغیر حکومت کے، اور خوش اخلاقی کے علاوہ کسی اور طرزِ اقتدار کے بغیر۔ ہماری موجودہ حالت یہ ہے: قانون کے بغیر آئین سازی، منصوبہ کے بغیر دانائی، نام کے بغیر ایک آئین۔ اور جو بات حیرت انگیز ہے وہ ہے، محتاجی کے لیے مقابلہ کرنے والی مکمل آزادی۔ یہ موقع بغیر کسی نظیر کے ہے، یہ معاملہ کبھی وجود تک نہ رکھتا تھا۔ چیزوں کے موجودہ کمزور نظام میں کسی بھی شخص کی جائیداد محفوظ نہیں۔ ہجوم کے ذہن کو بغیر سوچے سمجھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اپنے سامنے کوئی معین مقصد نہ دیکھتے ہوئے وہ اُسی بات کے پیچھے چل پڑتے ہیں جو قیاس انہیں پیش کرتی ہو۔ کچھ بھی مجرمانہ نہیں، غداری نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے جو چاہے

کرے۔ ٹوری لوگ جارحانہ انداز میں جمع ہونے کا تصور بھی نہ کرتے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ان کی زندگیاں، اُس اقدام کے ذریعے، ریاست کے قوانین کو قرق تھیں۔ جنگ میں پکڑے گئے انگریز سپاہیوں اور اسلحہ کے ساتھ پکڑے امریکی باشندوں کے درمیان فرق کی ایک لکیر ہونی چاہیے۔ اول الذکر قیدی ہیں، مگر ثانی الذکر تو غدار ہیں۔ ایک جرمانے میں اپنی آزادی دیتا ہے، دوسرا اپنا سر۔

ہماری بصیرت کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے ہماری کارروائیوں میں سے کچھ میں ایک کمزوری ہے جو اختلاف رائے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ غلام امریکہ کا کمربند بہت کھلے ڈلے طور پر بندھا ہے۔ اور اگر وقت پہ کچھ نہ کیا گیا تو کچھ کرنے کو بہت دیر ہو جائے گی اور ہم ایک ایسی صورت حال میں گھر جائیں گے جہاں نہ 'مفاہمت' عملی ہوگی اور نہ 'آزادی'۔ بادشاہ اور اس کے حقیر حواری غلام امریکہ کو تقسیم کرنے کا اپنا پرانا کھیل جاری رکھیں گے، اور ہمارے بیچ نہ چاہنے والے پرنٹرز ہیں جو خوش نما جھوٹ پھیلانے میں مصروف ہوں گے۔ وہ عیار اور منافقانہ خط جو چند ماہ قبل نیویارک کے دو اخباروں میں چھپا، اور اسی طرح دو اور اخبارات کے اندر، وہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ ایسے لوگ ہیں جو یا بصیرت مانتے ہیں یا دیانت۔

سوراخوں اور کونوں کے اندر گھس جانا اور مصالحت کی باتیں کرنا آسان ہے۔ مگر کیا ایسے لوگ سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ اور یہ کتنا خطرناک ثابت ہوگا، اگر اس پر کانٹی ننٹ تقسیم ہو جائے؟ کیا وہ اپنے خیال کے اندر انسانوں کے مختلف نظاموں کو لیتے ہیں جن کی صورت حال اور حالات، پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا وہ خود کو مظلوموں کی جگہ پر رکھیں گے جن کا 'سب کچھ پہلے ہی جا چکا ہے؟' اور کیا وہ خود کو اُس سپاہی کی جگہ پر رکھیں گے جس نے اپنے ملک کے دفاع کے لیے 'سب کچھ' تج دیا ہے؟ اگر ان کی ناپختہ میانہ روی، دوسروں سے قطع نظر 'صرف' ان کی اپنی ذاتی صورت حال سے موزوں ہو، تو وقت انہیں قائل کر دے گا کہ 'وہ اپنے میزبان کے بغیر حساب کتاب کر رہے ہیں۔

کچھ کہتے ہیں کہ ہمیں اُس جگہ پر رکھو جہاں ہم 1763 میں تھے۔ جس پر میں جواب دیتا ہوں کہ اس درخواست پر عمل کرنا اب برطانیہ کے بس میں نہیں ہے۔ مگر اگر ایسا ہوتا بھی، اور یہ

عطا بھی کی جاتی، تو میں ایک معقول سوال کے بطور پوچھتا کہ: ایک ایسے کرپٹ اور عہد شکن دربار کو کن ذرائع سے اُس کے وعدوں کو پورا کرنے پر رکھا جا سکتا ہے؟۔ایک اور پارلیمنٹ، نہیں، بلکہ یہی موجودہ پارلیمنٹ بھی، اس بہانے سے کہ یہ تشدد سے حاصل کیا گیا یا بے عقلی میں عطا کیا گیا، اس ذمہ داری کو منسوخ کرسکتی ہے۔ اور اُس صورت میں ہماری تلافی کہاں ہے؟۔قوموں کے ساتھ معاملات میں قانون کی طرف نہیں جایا جاسکتا کہ توپیں تاجوں کی بیرسٹر ہیں، اور تلوار (انصاف کے نہیں بلکہ جنگ کے) مقدمے کا فیصلہ کرتی ہے۔ 1763 کے مقام پر ہونے کو یہ کافی نہیں ہے کہ قوانین کو صرف اسی حالت میں رکھا جائے بلکہ، یہ بھی کہ ہمارے حالات کو بھی اسی حالت میں رکھا جائے۔اسی طرح ہمارے جلے اور تباہ کردہ قصبوں کی مرمت یا تعمیر کی جائے، ہمارے نجی نقصانات پورے کیے جائیں، ہمارے سرکاری قرضہ جات (دفاع کے واسطے لیے ہوئے) موقوف ہوں۔ وگرنہ تو ہم اُس سے لاکھوں گنا بدتر ہوں گے جہاں ہم بدخواہ عرصے میں تھے۔ اس طرح کی ایک درخواست، اگر ایک سال پہلے تعمیل ہو جاتی، تو غلام امریکہ کے دل اور روح جیت چکی ہوتی۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی۔

محض ایک تاوان کی سزا والے قانون کی منسوخی کے لیے ہتھیار اٹھانا آفاقی قانون کی طرف سے ناجائز سا لگتا ہے، اور انسانی احساسات سے متضاد سا لگتا ہے جیسے اطاعت گزاری لاگو کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں۔ کسی بھی پہلو سے مقصد ذریعہ کو جواز نہیں دیتا، اس لیے کہ ایسی معمولی باتوں کے لیے لوگوں کی زندگیاں ناکارہ کرنا بہت بھاری قیمت ہوتی ہے۔ یہ تشدد ہے جو ہمارے اجسام پر کیا جاتا ہے اور جس کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ایک مسلح فوج سے ہماری جائیداد کو تباہ کرنا، آگ اور تلوار سے ہمارے وطن پر حملہ کرنا جو کہ شعوری طور پر اسلحہ کے استعمال کو مستحق کرتا ہے، اور وہ گھڑی جس میں دفاع کے اس طرح کے طریقے ضروری ہو گئے تھے تو برطانیہ کی ساری محکومی کو ختم ہونا چاہیے تھا۔ اور امریکہ کی آزادی کو اُسی وقت سے تصور کرنا چاہیے تھا جس گھڑی اس کے خلاف 'پہلی گولی چلائی گئی تھی'۔ یہ لکیر استقامت کی ایک لکیر ہے، جسے نہ تلون مزاجی نے کھینچا، نہ ہوس نے اُسے تو سیع دی بلکہ اسے واقعات کے ایک تسلسل نے پیدا کیا، جن کے مصنفین امریکی غلام علاقے نہ تھے۔

میں ان تاثرات کو مندرجہ ذیل بروقت اور نیک ارادوں کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

آزادی حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔ اور اُن تینوں میں سے ایک، آج یا کل غلام امریکہ کا مقدر ہوگا:

1- کانگریس میں عوام کی قانونی آواز سے،

2- فوجی طاقت سے، یا

3- ایک بے ترتیب مجمع سے۔

ایسا اکثر نہیں ہوسکتا کہ ہمارے فوجی مہذب شہری ہوں، اور، لوگوں کے اژدھام معقول لوگ ہوں۔ نیکی، جیسے کہ میں نے پہلے کہا، موروثی نہیں ہوتی، نہ ہی یہ دوامی ہوتی ہے۔ اُن ذریعوں میں سے پہلے کے ذریعے ایک آزادی لائی جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ روئے زمین پر نجیب ترین، خالص ترین آئین بنانے کے لیے ہمارے پاس ہر موقع، اور ہر حوصلہ افزائی موجود ہے۔ یہ ہمارے بس میں ہے کہ دنیا کو از سر نو شروع کریں۔ موجودہ صورت حال نوح کے زمانے سے لے کر آج تک وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک نئی دنیا کا یومِ پیدائش پاس ہی ہے۔ اور انسانوں کی ایک نسل چند مہینوں کے اندر اندر آزادی کا اپنا حصہ وصول کرنے والی ہے۔ یہ فکر باوقار ہے، اور اس نکتہ نظر میں، چند کمزور یا مفاد رکھنے والے لوگوں کی چھوٹی حقیر نکتہ چینیاں بہت مضحکہ خیز اور حقیر لگتی ہیں۔

کیا ہمیں موجودہ موزوں اور دعوت دیتے ہوئے زمانے کو نظر انداز کرنا چاہیے، اور بعدازاں آزادی دیگر ذرائع سے حاصل ہونی چاہیے؟۔ ہمیں نتیجہ کی ذمہ داری خود اپنے اوپر ڈالنی چاہیے، یا اُن کے اوپر جن کی تنگ اور متعصّبانہ ارواح عادتاً بغیر معلومات یا غور و فکر کیے اقدام کی مخالفت کر رہی ہیں؟۔ آزادی کی حمایت میں دلائل دینے ہوتے ہیں جنہیں لوگوں کو نجی طور پر خود سوچنا چاہیے بجائے یہ کہ انہیں سرعام بتانا پڑے۔ ہمیں اب اس پر بحث نہیں کرنی چاہیے کہ ہم آزاد ہوں گے یا نہیں، بلکہ اُسے ایک مضبوط اور باوقار بنیاد پہ حاصل کرنے پہ بے تاب ہونا چاہیے۔ ہر نیا دن ہمیں اس کی لازمیت کا قائل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹوریوں، کو اسے فروغ دینے میں سب سے آگے ہونا چاہیے، اس لیے کہ جیسا کہ کمیٹیوں کے قیام نے انہیں عوامی غیض و غضب سے محفوظ رکھا، اس لیے ایک

حکومت کی ایک اور مستحکم صورت انہیں اس کے تسلسل سے جاری رکھ سکے گی۔ اگر ان کے پاس وِگ ہونے کے لیے کافی صلاحیتیں نہیں ہیں، تو انہیں آزادی کے لیے خواہش کرنے کی کافی قابلیت رکھنی چاہیے۔

المختصر، آزادی وہ واحد بندھن ہے جو ہمیں باہم متفق اور اکٹھا رکھ سکتی ہے۔ تب ہم اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے، اور ہمارے کان ایک سازشی اور ظالم دشمن کے منصوبوں کے خلاف قانونی طور پر بند ہوں گے۔ نیز، ہم برطانیہ کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی موزوں بنیادوں پر ہوں گے، اس لیے کہ معاہدہ کے لیے دلیل ہے، کہ مصالحت کی شرائط کے لیے اس دربار کے غرور کو 'ریاستہائے امریکہ' کے ساتھ امن کی شرائط کے لیے سلوک کرتے ہوئے کم ٹھیس پہنچے گی، بہ نسبت اُن شرائط کے جنہیں وہ 'باغیانہ محکوموں' کا نام دیتا ہے۔ یہ ہماری تاخیر ہے جو اُسے فتح کے لیے امید دلاتی ہے، اور ہماری پسماندگی صرف جنگ کو طوالت دیتی ہے۔ جس طرح کہ ہم نے (اُس سے کسی اچھے نتیجے کے بغیر)، اپنی شکایات کے حصول کی خاطر اپنی تجارت روک دی، آیئے اب ہم متبادل آزماتے ہیں 'آزادانہ طور پر' خود ان کی تلافی کر کے، اور پھر تجارت کھولنے کی پیش کش کر کے۔ انگلینڈ کا اجناس کا تاجر اور فہمیدہ حصہ پھر بھی ہمارے ساتھ ہوگا، اس لیے کہ تجارت قابلِ ترجیح ہے، بہ نسبت 'اس کے بغیر' جنگ کے۔

ان دلائل پر میں معاملے کو ختم کرتا ہوں۔ اور چونکہ اس پمفلٹ کے پچھلے ایڈیشنوں میں موجود نظریے کو کسی نے بھی مسترد نہیں کیا، تو یہ ایک ثبوت ہے کہ یا تو اس نظریے کو باطل ثابت کیا نہیں جا سکتا، یا، یہ کہ اس کی حمایت والا فریق تعداد میں اس قدر بڑا ہے کہ اس کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ایک دوسرے کو شک سے دیکھنے کے بجائے، آیئے ہم میں سے ہر ایک اپنے پڑوسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے، اور ایک ایسی لکیر کھینچنے میں متحد ہوں، جو فراموشیدگی کے ایک اقدام کی طرح، ہر سابقہ اختلاف کو بھول جانے کی قبر میں دفن کر دے۔ وِگ اور ٹوری کے ناموں کو معدوم ہونے دو، اور ہمیں ان الفاظ کے علاوہ کچھ بھی سننے نہ دو: 'ایک اچھا شہری'، 'ایک کھلا اور پکا دوست'؛ 'عالمِ نو کا ایک باصلاحیت حمایتی'، 'آزاد اور خودمختار ریاستہائے امریکہ'۔

کامن سینس کی مقبولیت

اب تو ٹام پین کا مجموعۂ تصانیف پورے کا پورا ملتا ہے۔ ایک ہی جلد میں اس کی ساری تحریریں یکجا ملتی ہیں۔ مگر کامن سینس تو ساری کتاب کی روح ہے۔ آپ پڑھنے لگیں تو لگتا ہے اُس میں کوئی بات نئی نہیں ہے۔ وہی عام باتیں جو میں اور آپ جانتے ہیں۔ مگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر بات نئی ہے۔ ہر بات آپ کے دل میں اترتی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، سادہ سی زبان ہے، کوئی سکول ماسٹروں، مقرروں، مصلحوں، اور لیڈروں والا لہجہ نہیں ہے۔ وہ عام، نیم خواندہ قاری سے بلاواسطہ بات کرتا تھا، بائبل کے جملوں اور اقتباسات میں ملفوف۔ کوئی بڑی فلسفیانہ باتیں نہیں بلکہ وہ قائل کرنے کے انداز میں سیدھی مخلصانہ اور سچی بات کرتا تھا۔ ایسی باتیں ایسے سادہ سے انداز میں کہ سیدھا قاری کے دل و دماغ پہ قبضہ کریں۔ سچائی کا اس کا ای میل سیدھا اگلے کے اکاؤنٹ میں چلا جاتا جس سے اس کا قاری اُس کی سوچ کا ساتھی بن جاتا تھا۔ میں نے جس بھی بڑے ادیب کو ٹام پین کا مجموعۂ تصانیف دیا، اُس نے تکلف میں، میری خاطر اسے پڑھا۔

..........مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ اُس تصنیف کی تعریفیں کرنے لگا۔اس شخص نے آمریت کے حق میں پوری تاریخ میں موجود دلیلوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا اور بڑی تفصیل سے اپنے منطقی انداز میں لکھتے ہوئے ان سب کو باطل قرار دیا۔ کاسموس کے مصنف کارل ساگاں سے دوسو سال پہلے ٹام پین نے کہا تھا کہ ''ساری دنیا میرا گھر ہے اور انسانوں کی بہتری کے لیے کام کرنا میرا مذہب ہے''۔

پین اور اس کا کامن سینس ہر جگہ موضوعِ بحث بنے ہوئے تھے۔محفلوں میں اُسی کی حمایت یا مخالفت ہو رہی ہوتی۔جنوری 1776 میں فلیڈیلفیا کی گلیوں میں نمودار ہونے والی اس مختصر تصنیف نے فوری کامیابی پالی۔ پل جھپکتے ہی اس کی کاپیاں امریکہ کے کونے کونے میں میسر ہوگئیں۔ پہلے ہی سال اس کے 25 ایڈیشن چھپے۔اس کا کتابچہ باقاعدہ ایک دوسری انجیل بن چکا تھا۔آگ بھرے الفاظ، نعرے الفاظ، ترانے الفاظ، گنگناتے الفاظ...... ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے والے الفاظ۔......اور پھر کوئی بھی امریکی غلامی کے بارے میں 'بغیر فیصلہ' کے نہ رہا۔ڈگمگانا ختم، جھجک والا ذہن صاف۔ جارج واشنگٹن کی آزادی کی سپاہ آناً فاناً پھول کر کئی گنا بڑی ہوگئی۔اور ہر سپاہی اب شعوری طور پر برطانیہ کے خلاف لڑ رہا تھا۔آزادی اور انقلاب اب امریکہ میں گھریلو الفاظ بن چکے تھے۔

اس شخص کی اس تحریر نے عوام الناس کے دل و دماغ جھنجھوڑ کر رکھ دیے۔فوری کامیابی! تین مہینوں میں پبلشروں کی جانب سے جائز اور ناجائز چھاپے گئے اس کتابچے کی پانچ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ دنیا بھر کے انقلابات کی تاریخ میں یہ مقبول ترین کتابچہ تھا۔(یہ 48 صفحات پر مشتمل تھا)۔آزادی کے شعلوں کو گویا آکسیجن کے انبار ملے ہوں۔نوآبادی نظام میں موجود نام نہاد امن اور سکون کو آگ لگ چکی تھی۔انسانی ضمیر کو درکار کچوکا لگ چکا تھا۔ایک لمبی جدوجہد کی بسم اللہ ہو چکی تھی۔

پین، اب پین نہیں رہا تھا، بلکہ اب اس کی شناخت کامن سینس کے بطور ہو چکی تھی۔

اب سب لوگ اُسے اِسی نام اور اِسی نسبت سے جانتے تھے: مسٹر کامن سینس۔

اس نے کامن سینس سے حاصل ہونے والی ساری رائلٹی آزادی کے لیے برسرِ

پیکار فوجوں کو عطیہ کے طور پر دے دی۔

اسے 'امریکی انقلاب کا باپ (بابا)' کہا جانے لگا۔اس نے اس پمفلٹ میں صرف غلامی کے خلاف نہ لکھا بلکہ اس نے بادشاہت کے خلاف بھی لکھا جس کا تلخ ذائقہ وہ برطانیہ میں چکھ چکا تھا۔لہٰذا 'آزادی اور جمہوریت' کی بات اس پمفلٹ کی ہر سطر میں موجود تھی۔ یہ پمفلٹ ایسا مقبول ہوا کہ یہ کہنا جائز ہے کہ امریکہ کی آزادی میں اس کا حصہ بہت بڑا ہے۔

جب کوئی گھر محفوظ نہ تھا، جب ہر گھنٹہ خطرے کا گھنٹہ تھا، جب ٹارچر مارے ذہن کو کسی آرام یا ستانے کا معلوم نہ تھا اور ہر چیز الوداع کہہ رہی تھی۔ دنیا کہنے لگی کہ اس جتنا بڑا سیاسی لکھاری نہ ہوگا۔اُس میں کمال یہ ہے کہ وہ عام سی سیاسی بات اٹھاتا ہے، اور پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے۔اور بالآخر سچ تک پہنچتا ہے۔اس سارے سفر میں وہ اپنے قاری کو سختی سے گرفت میں رکھتے ہوئے چلتا ہے۔عقل اور سچ، تفکر اور آزادی، جدوجہد اور قربانی...... کامن سینس آج بھی ہم تیسری دنیا کے محکوم عوام کے لیے نصاب کا درجہ رکھتا ہے۔

اثر اس قدر گہرا کہ جس نے کتاب پڑھی، وہ آپے میں نہ رہا۔تحریکِ آزادی میں شامل ہوا اور امریکہ کو آزاد کرنے تک اس تحریک میں شامل رہا۔اور جب امریکہ آزاد ہوا تو پھر اس ملک کے آئین کے ایک ایک لفظ میں کامن سینس کا ذائقہ شامل ہوا۔

یہ جو آج امریکہ ہے، وہ تو جارج واشنگٹن کا بگڑا ہوا بچہ ہے۔امریکہ کا اگر آزادی کا اصلی اعلان دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔اس قدر شاندار ہے۔یہ جو اس کا نام ہے ناں: 'ریاستہائے متحدہ امریکہ' یہ حسین نام سب سے پہلے اُسے سٹیزن ٹام پین نے اُسے دیا تھا۔

پین کا پمفلٹ بے حد مقبول ہوا۔بسوں میں، تھڑوں پر، کام کی جگہوں پر، الغرض جہاں کوئی انسانی ذی روح تھا، پین کا کامن سینس وہاں موجود تھا۔لوگ اسے پڑھنا چاہتے تھے، دوبارہ، سہ بارہ پڑھنا چاہتے تھے کہ اُن کی آنکھیں یہی کچھ دیکھنا چاہتی تھیں۔اُن کے دلوں میں جو سوالات موجود تھے، یہ پمفلٹ اُن کے جوابات مہیا کرتا تھا۔ایسے جوابات جن سے وہ متفق تھے۔ وہاں ہمارے ہاں کے چینکی ہوٹل نہیں تھے، بلکہ انہی کی طرح کے شراب خانے تھے۔ عام نیم خواندہ

لوگوں کا قہوہ خانہ جیسا۔ پورے امریکہ میں ایک بھی شراب خانہ ایسا نہ تھا جہاں پین کا یہ کتابچہ موجود نہ ہوتا۔اور عام آدمی تو جب تک زور زور سے نہیں پڑھے گا، بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ چنانچہ ایک پڑھتا تو پورا شراب خانہ سنتا۔اور اس قدر زور آور دلائل اور اس قدر دل میں اتر جانے والا اسلوب ،وہیں بیٹھے بیٹھے فوری فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ۔ پین فوری ہاضمے والے اسلوب میں لکھتا تھا۔ چنانچہ بحثیں، مباحثے اور فیصلہ..........آزادی کے حق میں، مکمل آزادی کے حق میں۔

یہ خوش قسمت کتابچہ جنوری 1776 میں شائع ہو کر قبولیت کے آسمان پر چھا گیا اور ٹھیک سات ماہ بعد 4 جولائی 1776 کو آزادی کا اعلان کانگریس کی جانب سے کیا گیا، جس کا مغز کامن سینس نامی پمفلٹ تھا۔

****

امریکہ کا اعلانِ آزادی

امریکہ کی تیرہ متحدہ ریاستوں کا متفقہ اعلان نامہ

انسانی واقعات کے تسلسل میں جب ایک قوم کے لیے اُن سیاسی بندھنوں کا تحلیل کرنا ضروری ہو جاتا ہے جنہوں نے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ اور دنیا کی قوتوں کے درمیان ایک الگ اور مساوی مقام حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے جو قوانین فطرت اور فطرت کے خدا نے انہیں مستحق کیے ہیں، تو بنی نوعِ انسان کی آرا کے نفیس احترام کا تقاضا ہے کہ وہ اُن وجوہات کا اعلان کر دیں جو انہیں علیحدگی پر دھکیلتی ہیں۔

ہم اِن سچائیوں کو اظہر من الشمس گردانتے ہیں کہ سارے انسان مساوی تخلیق ہوئے ہیں ، یہ کہ انہیں اُن کے خالق نے کچھ ناقابلِ منتقلی حقوق سے سرفراز کیا ہے، جن میں زندہ رہنے کا حق ، لبرٹی اور خوشی کی تلاش کے حقوق شامل ہیں۔ یہ کہ اِن حقوق کے حصول کے لیے انسانوں کے بیچ میں سے حکومتیں تشکیل پاتی ہیں جو کہ اپنے اختیارات انھی لوگوں کی رائے سے اخذ کرتی ہیں جن پر حکومت کی جا رہی ہوتی ہے۔ یہ کہ جب کبھی حکومت کی ایک صورت ان مقاصد کے لیے تباہ کن بن جائے تو

عوام کا حق ہے کہ اسے بدل ڈالیں یا ختم کر دیں اور نئی حکومت قائم کریں جس کی بنیادیں ایسے اصولوں پر رکھیں اور جس کے اختیارات ایسی صورتوں میں متشکل کر دیں جو انھیں اپنی حفاظت اور خوشی کے لیے موزوں ترین لگتی ہو۔ بلاشبہ عقل حکم لگا دے گی کہ طویل عرصہ سے قائم شدہ حکومتوں کو ہلکے اور وقتی اسباب پہ تبدیل نہیں کیا جانا چاہیے۔اور سارے تجربات نے بتا دیا ہے کہ بنی نوعِ انسان ابتلا کو زیادہ مائل ہے، جبکہ برائیاں قابلِ برداشت ہیں، بہ نسبت اُن صورتوں کو ختم کر کے خود کو سیدھا کرنے کے، جن کے وہ عادی ہیں۔ جب ناروائیوں اور دست درازیوں کا ایک لمبا سلسلہ اسی ایک چیز کو تلاش کرتے ہوئے حتمی 'مطلق العنانی' کے تحت انہیں گھٹانے کا ارادہ کر لے تو یہ اُن کا حق اور فریضہ ہے کہ وہ ایسی حکومت کو اٹھا کر پھینک دیں، اور اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے نئے محافظ بھرتی کر لیں..........ایسا رہا ہے اِن کالونیوں کا تحمل اور برداشت ۔ اور یہی ہے اب لزومیت جو انہیں اپنے 'سابقہ نظام حکومت' کے بدل ڈالنے کو مجبور کرتی ہے۔ برطانیہ کے موجودہ بادشاہ کی تاریخ بار بار کے زخموں اور قبضوں کی تاریخ ہے، سب کا براہِ راست مقصد ان ریاستوں پر ایک مطلق 'استبداد' مسلط رکھنا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے راست باز دنیا کے سامنے 'حقائق' پیش ہونے چاہئیں۔

اُس نے ایسے قوانین کو منظور کرنے سے انکار کر دیا جو کہ عوامی بہبود کے لیے خوشگوار اور ضروری ہیں۔

اُس نے اپنے گورنروں کو فوری اور اشد قوانین پاس کرنے سے منع کر دیا، اُس وقت تک اُن پر عمل درآمد معطل کر دیا جب تک کہ اُس کی منظوری حاصل نہ کی جائے؛ اور جب یہ معطل ہوئے تو اُس نے اُن پر توجہ دینے کو حتماً نظرانداز کر دیا۔

اُس نے عوام کے عظیم حلقوں/خطوں کی گنجائش/رہائش کے لیے دوسرے قوانین پاس کرنے سے انکار کر دیا، جب تک کہ وہ عوام آئین ساز ادارے میں نمائندگی کے حق سے دست بردار نہ ہوں، ایک ایسا حق جو اُن کے لیے انمول ہے اور جو صرف جابروں کے لیے ڈراؤنا ہے۔

اس نے اکٹھے آئین ساز اداروں کا اجلاس ایسی جگہوں پر طلب کیا جو غیر معمولی ہیں، غیر

آرام دہ ہیں اور اپنے پبلک ریکارڈوں کے صدر مقام سے دور ہیں۔ واحد مقصد یہ ہے کہ انہیں اُس کے اقدام سے تعمیلِ حکم میں تھکا کر چور چور کیا جائے۔

اُس نے عوام کے حقوق پر اپنے حملوں کی مردانہ وار مضبوطی کے ساتھ مخالفت کرنے پر نمائندگی کے ایوانوں کو بار بار تحلیل کیا۔

ایسی تحلیلوں کے بعد، اس نے ایک طویل مدت تک، دوسروں کو منتخب ہونے دینے سے انکار کیا، جس کے سبب کالعدم ہونے کے ناقابل، آئین سازی کے اختیارات استعمال کے لیے عوام کے پاس آئے۔ اسی دوران ریاست سارے بیرونی حملوں، اور اندرونی بے چینیوں کے خطرات کے لیے کھلی رہی۔

اُس نے اِن ریاستوں کی آبادی کو روکنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے غیر ملکیوں کو شہریت دینے کے لیے قوانین میں رکاوٹ ڈالی، دوسروں کو اُن کی نقل مکانیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کو منظور کرنے سے انکار کر دیا، اور اراضی کے تصرف رقبضہ کے نئے حالات پیدا کیے۔

اُس نے عدلیہ کے اختیارات کی منظوری سے انکار کر کے انصاف کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ڈالی۔

اُس نے ججوں کے عہدے کی مدت اور اُن کی تنخواہوں کی رقم کا اختیار اپنے پاس رکھ کر انہیں محض اپنی رضا کا محتاج بنایا۔

اُس نے ’نئے عہدوں‘ کا ایک انبار کھڑا کر دیا، اور افسروں کے لشکروں کو ہمارے عوام کو ہراساں کرنے، اور اُن کے گزر بسر کے سامان کو کھا ڈالنے کو بھیجا۔

اُس نے ہمارے آئین سازوں کی مرضی کے بغیر، امن کے زمانوں میں ہمارے درمیان ’فوجیں‘ رکھیں۔ اُس نے ملٹری کو سول حاکمیت سے آزاد اور بالا رکھا۔

وہ ہمیں ہمارے آئین سے ایک اجنبی حلقۂ عدلیہ کے تحت رکھنے کے لیے دوسروں سے ملا، اور اس نے ہمارے قوانین سے منکر ہو کر دکھاوے کی آئین سازی کی منظوری دی:

ہمارے بیچ مسلح افواج کے بڑے دستوں کو متعین کرنے کے لیے:

ایک مضحکہ خیز مقدمے کے ذریعے اُن کی طرف سے اِن ریاستوں کے باشندوں پر کسی قتل کے لیے سزا سے انہیں بچانے کے لیے:

دنیا کے سارے خطوں کے ساتھ ہماری تجارت کو بند کرنے کے لیے:

ہماری رضا کے بغیر ہم پر ٹیکس لاگو کرنے کے لیے: جیوری کے ذریعے ہمیں ٹرائل کے فوائد سے محروم رکھنے کے لیے:

جھوٹ موٹ کے جرائم پر مقدمہ چلانے کے لیے ہمیں سمندر پار لے جانے کے لیے:

ایک پڑوسی علاقے میں انگریزی قوانین کے آزاد نظام کو ختم کرنے کے لیے، اور پھر ایک من مانی حکومت قائم کرنے کے لیے، اور اُس کی سرحدیں وسیع کرنے کے لیے تاکہ اُسے فوراً ایک مثال بنائے اور دوسری نوآبادیوں میں وہی آمرانہ حکمرانی لاگو کرنے کو موزوں ہتھیار بنائے:

ہمارا چارٹر چھیننے کے لیے، ہمارے بیش قیمت ترین قوانین کو ختم کرنے، اور ہمارے طرز ہائے حکومت کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے کے لیے:

ہمارے اپنے آئین سازوں کو معطل کرنے کے لیے، اور اُن کی بجائے اپنے والوں کو ہمارے لیے ہر طرح کے معاملات میں قانون سازی کا اختیار دینے کا اعلان کرنے کے لیے۔

اُس نے ہمیں اپنی حفاظت سے باہر ہونے، اور ہمارے خلاف جنگ کا اعلان کر کے یہاں حکومت چھوڑ دی۔

اس نے ہمارے سمندر لُوٹ لیے، ہمارے ساحل برباد کر دیے، ہمارے شہر جلا ڈالے، اور ہمارے عوام کی زندگیاں برباد کر دیں۔

وہ اس گھڑی موت، ویرانی اور استبدادی کاموں کی تکمیل کے لیے خارجی کرائے کے قاتلوں کی بڑی فوجیں بھیج رہا ہے۔ وہ ظلم اور فریب کے حالات پہلے ہی شروع کر چکا ہے جن کی مثال بربریت والے زمانوں میں بھی نہیں ملتی، اور جو ایک مہذب قوم کے سربراہ کے مکمل طور پر شایانِ شان نہیں۔

اُس نے سمندروں میں پکڑے ہمارے ہم وطنوں کو اپنے وطن کے خلاف اسلحہ رکھنے پہ قید

کیا، تاکہ وہ اپنے دوستوں اور بھائیوں کے جلاّد بن جائیں، یا خود کو اپنے ہاتھوں سے زوال کریں۔

اُس نے ہمارے اندر داخلی بغاوتوں کو بھڑکایا اور ہماری سرحدوں کے باشندوں پر، ناترس انڈین وحشی لانے کی کوشش کی، جن کا اصولِ جنگ بلاتفریقِ عمر، جنس اور حالات سب کی تباہی ہے۔

اِن آپریشنوں کے ہر مرحلے پر ہم نے عاجز ترین انداز میں درستگی کی اپیل کی۔ ہماری اپیلوں کا جواب بار بار زخموں سے دیا گیا۔ ایک شہزادہ جس کا کیریکٹر ہر اُس اقدام سے عبارت ہے جو ایک ظالم کو بیان کرے، ایک آزاد قوم کے حکمران بننے کے لیے اَن فٹ ہے۔ نہ ہی ہم اپنے برطانوی بھائیوں کو لاپرواہی سے چاہتے رہے ہیں۔ ہم نے اُن کے آئین سازوں کی ہم پہ ایک ناجائز حلقۂ عدلیہ بڑھانے کی کوششوں سے انہیں وقتاً فوقتاً خبردار کیا۔ ہم نے انہیں یہاں اپنے ترکِ وطن اور قیام کے حالات کے بارے میں بتایا۔ ہم نے اُن کو اُن کے مقامی انصاف اور بڑے پن کا واسطہ دیا، اور ان قبضہ گیریوں کی تردید کو اپنے مشترک بھائی بندی کے رشتوں سے انہیں واسطہ دیا، جو ناگزیر طور پر ہمارے رابطوں اور مراسلوں میں دخل دے گا۔ مگر، وہ بھی انصاف اور یگانگت کی آواز پہ بہرے رہے۔ چنانچہ ہمیں لزومیت میں اُس بات کو تسلیم کرنا ہوگا، جو ہماری علیحدگی کی پیش گوئی کرتا ہے، اور ہمیں انہیں بقیہ نوعِ انسان کی طرح جنگ میں دشمن، اور، امن میں دوست قرار دینا ہوگا۔

لہٰذا ہم جنرل کانگریس میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نمائندے جمع ہوکر دنیا کے سپریم جج کو ہمارے ارادوں کی راستی کی اپیل کرنے، اِن نوآبادیوں کے اچھے لوگوں کے نام اور اتھارٹی پر متین انداز میں چھاپتے اور اعلان کرتے ہیں کہ یہ متحدہ نوآبادیاں، آزاد اور خودمختار ریاستیں ہیں۔ کہ یہ برطانوی تاج کی ساری وفاداری سے آزاد ہیں۔ اور یہ کہ اُن کے اور ریاست برطانیہ کے درمیان سارے سیاسی رشتے مکمل طور پر تحلیل کیے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ آزاد اور خودمختار ریاستوں کے بطور وہ جنگ کرنے، امن معاہدے کرنے، اتحادیں بنانے، تجارت کرنے، اور دوسرے وہ تمام اقدامات کرنے کا اختیار رکھتی ہیں جو کہ آزاد ریاستیں کرنے کا حق

رکھتی ہیں۔ اور اس اعلان نامے کی حمایت کے لیے مشیتِ ایزدی پر مضبوط بھروسے کے ساتھ، ہم ایک دوسرے کے ساتھ اپنی زندگیوں، اپنے مستقبلوں اور اپنے پاک وقار کا عہد کرتے ہیں............!!"

امریکی بحران

غلام امریکی عوام کی قابض برطانوی فوج سے انقلابی لڑائی جاری تھی۔ پین کندھے پہ ایک بندوق لٹکائے آزادی کی اِس جنگ میں بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ قلم والے آدمی نے بندوق تھام لی۔ بندوق جو اُس نے اپنی ساری عمر نہ چلائی تھی۔ مگر قلم بھی تو اُس نے اٹھانے سے قبل کبھی نہ اٹھایا تھا۔ سماجی ضرورت اپنے قلم بردار بھی خود پیدا کرتی ہے اور بندوق بردار بھی!!۔

جنگِ آزادی کے دوران جب جب ضرورت پڑتی وہ ایک سپاہی کی طرح لڑائی میں حصہ لیتا۔ اور جنگی حالت میں نہ ہونے کے وقت وہ ایک پروپیگنڈچی کا رول ادا کرتا۔ وہ پروپیگنڈچی بھی دلچسپ تھا۔ مشکل ترین پروپیگنڈہ شکست کی حالت میں ہونے کے دوران ہوتا ہے۔ پین بھی اسی طرح، جب ناروائیوں اور دست درازیوں کا ایک لمبا سلسلہ اسی ایک چیز کو تلاش کرتے ہوئے ‘حتمی مطلق العنانی’ کے تحت انہیں گھٹانے کو ایک مشکل سے دوچار تھا۔ شکست در شکست، کہیں کوئی کامیابی نہ تھی۔ وہ شکست میں پروپیگنڈچی تھا۔ شکست میں امید کا پروپیگنڈچی۔ اپنے سپاہیوں، ساتھیوں کو (عام معمولی انسانوں) کے ساتھ اکٹھ اور برادری میں اٹھنا بیٹھنا، پریڈ کرنا، باتیں کرنا، پڑھ کر سنانا، شراب پینا اور دکھ درد میں شریک رہنا اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس قلم کار سپاہی کو کیپٹن، میجر اور کرنل کے عہدے اچھے نہ لگے تھے، اس لیے پیشکشوں کو مسترد کر کے وہ عام سپاہی کی طرح لڑ رہا تھا۔

امریکہ کی عوامی آزادی کی افواج کی کمان جارج واشنگٹن کر رہا تھا۔ (کمال کی بات یہ ہے کہ پین اُس سے متاثر تھا۔ اس نے اس کی زبردست تعریفیں لکھیں۔ مگر جب یہی واشنگٹن بعد میں آزاد امریکہ کا صدر بنا تو سب کچھ بھول بھال کر اپنے سرمایہ دار طبقے کی خدمت میں لگ گیا)۔

بہرحال، یہ امریکی عوامی فوج کے لیے بہت ہی برا وقت تھا۔ دشمن (برطانوی) فوجیں، فتح پر فتح پاتی جا رہی تھیں اور امریکی سپاہِ آزادی جگہ جگہ شکست سے دوچار ہو رہی تھی۔ جارج واشنگٹن کی سپاہِ آزادی برباد ہونے کے قریب تھی۔ انگریز کی فتح جگہ جگہ مستحکم ہو رہی تھی۔ کوئی گھر محفوظ نہ تھا۔ ہر گھنٹہ الارم اور خطرے کا گھنٹہ تھا، ٹارچر مارے ذہن کو کسی ستانے والی حالت کا معلوم نہ تھا اور ہر چیز الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک عمومی مایوسی تھی۔ ناامیدی اور ذہنی پسپائی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

ایسی ذہنی حالت کو دوبارہ صحت مند بنانا، اور سپاہِ آزادی کو جنگِ آزادی پر شعوری طور پر لگا دینا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس شکست خوردگی کی ذہنی حالت کی 180 زاویے پر واپسی کے لیے زبردست صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ کام ٹام پین نے کر دکھایا۔ اُس کی ساری تخلیقی صلاحیتیں جیسے جاگ گئی ہوں۔ اس نے تحریر کی ایسی روشنی بکھیر دی کہ مایوسیاں دُم دبا کر بھاگ گئیں اور پناہ کے لیے مخالف فوج میں جا گھسیں۔ چونکہ سپاہِ آزادی بہت بڑے بحران سے گزر رہی تھی اس لیے اب کی بار، ٹام پین نے اپنی تحریر کو 'بحران' کا نام دے دیا؛ **امریکی بحران** ۔.......... مجموعی طور پر یہ تقریباً 25 کتابچوں کا ایک آتشیں اور گرم جوش سلسلہ تھا۔ وہ ہر بار گداگر کی طرح پریس، اور کاغذ تلاش کرتا۔ شکست کو کون کاغذ دیتا ہے، کون پریس دیتا ہے۔ فتح کے تو بیٹے بھی بہت ہوتے ہیں اور باپ بھی بے شمار۔ وہ کاغذ، سیاہی اور پریس کے لیے منتیں کرتا، دھمکیاں دیتا، دلیلیں لاتا۔ پرنٹروں کو، پبلشروں کو، ٹائپ والوں کو، کاغذ ذخیرہ کرنے والوں کو۔ اس کے پمفلٹوں کے موضوعات تھے: غلامی کیا ہے، آزادی کیا ہوتی ہے، آزادی کے لیے لڑائی کیوں ضروری ہے؟۔ بندوق کس پر اور کیوں چلائی جا رہی ہے؟۔ پہلا تھا؛ 'بحران نمبر ایک'۔ اس میں امید تھی، حوصلہ و ہمت بڑھانا تھا، غصہ تھا، اور وقار تھا۔

جنگ تو ہولناک چیز ہوتی ہے:

"ہاں۔ جنگ کے بارے میں کچھ اچھا نہیں ہوتا، کچھ عمدہ، کچھ اشراف نہیں ہوتا۔

...........انسانوں کو آزاد کرو تا کہ زمین خدا کی مقدس روشنی سے چمک اٹھے! اور پھر وہ بھاگ جاتے ہیں، وہ اپنے گھر چھوڑ دیتے ہیں، وہ اپنے دروازے بند کر دیتے ہیں اور تمہارا بھیجا اڑا دیتے ہیں۔ اگر خدا نہ کرے تم پانی کا ایک کٹورا مانگو تو وہ تمہیں ایک ڈاکو جان کر جہنم واصل کرتے ہیں!۔

''آپ کا کیا خیال ہے امریکی کس طرح کے لوگ یا مسیحی ہوں گے، جنھیں اپنی عاجز ترین درخواستوں کو ہتک آمیز انداز میں مسترد ہوتے دیکھنے کے بعد؛ ہر جگہ انہیں بے آرام کرنے کے لیے سنگین ترین قوانین منظور کرنے؛ ان پر ایک غیر اعلانیہ جنگ مسلط کرنے، اور انڈینز اور نیگروز ذبح کرنے کے لیے مدعو کرنے، جنہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھنے کے بعد، اپنے ساتھی شہری جیلوں میں بھوک سے مرتے دیکھنے کے بعد، اور اپنے گھر اور جائیداد تباہ اور جلائے جائے دیکھنے کے بعد؛ جنہوں نے آسمان کو سنجیدہ ترین اپیلیں کرنے کے بعد، آپ سے وابستہ ساری حکومت کے متین و سنجیدہ ترین حلف کے بعد، اور ایک دوسرے سے دلی قول وعہدوں اور عقیدہ کے اقراروں کے بعد؛ اور جنہوں نے دوستی کو التجائیں کرنے کے بعد، اور دوسری قوموں کے ساتھ اتحادوں میں شامل ہونے کو کم از کم آپ کے مہیب اور مطعون و مردود مانتے ہوئے ان ساری سول اور دینی ذمہ داریاں توڑ پھوڑ دینی چاہئیں...........''۔

ٹام پین، امریکی جنگِ آزادی کو محض زمینی ٹکڑے کی آزادی قرار نہیں دیتا۔ وہ اسے ایک 'وسیع' کاز' قرار دیتا ہے۔ طبعی و فکری آزادی ایک ایسا کاز ہوتی ہے جس میں آزادی خواہوں کو اگر شکست بھی ہو تب بھی یہ فاتح کو برباد کر دیتی ہے۔ غاصب ایک انچ فتح کرنے یا قبضہ میں کیے رکھنے کی جو قیمت ادا کرتا ہے، وہ انسانی سوچ سے بھی زیادہ اور مہنگی ہے۔ اُس کی ہر فتح دراصل اس کی شکست کو قریب تر اور گھمبیر تر بناتی جاتی ہے۔ قابض سپاہ کے دلوں دماغوں میں مادی لالچ کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جبکہ آزادی کا سپاہی مادی مالی حاصلات کو ابلیسیت سمجھتا ہے۔ اِس جنگِ آزادی میں ہر امریکی کا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ دشمن کا کام لوٹ مار اور تباہی تھا۔ اُس کا کمانڈر اپنے سپاہیوں کو دوسرا نعرہ دے ہی نہیں سکتا۔ جبکہ امریکی آزادی پسند کبھی اِس گلی کو بچاتا ہے، کبھی اُس کھیت کو روندے جانے سے بچاتا ہے، کبھی اِس خوبصورتی کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، اور کبھی اُس حسن کو باقی

رہنے دینا چاہتا ہے۔

ٹام پین اس بات کو خلافِ عقل قرار دیتا ہے کہ بارہ پندرہ ہزار برطانوی فوجی، آزادی کے جذبے سے سرشار ایک پوری آبادی سے زور ہوں گے۔ وہ امریکی عوامی فوج کے لیے نت نئے جنگی حربے اور داؤ پیچ تجویز کرتا ہے۔ وہ ایک محاذ پہ قلم اٹھاتا ہے اور اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے دراصل پوری انقلابی امریکی جنگ کے داؤ پیچ کو چھیڑ رہا ہوتا ہے ......اور اُسے حتمی حکمتِ عملی کی مطابقت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ امریکی انقلابی جنگ کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ ہر امریکی کے دل میں جاگزیں کرتا ہے۔ یہ جنگ اجتماع کے ساتھ ساتھ انفرادی بھی بن جاتی ہے۔ ہمہ نفری اور ہر نفری جنگِ آزادی، جس کے نتیجے میں بادشاہت اور وڈیرہ گیری بھی ختم ہو، اور عام انتخابات کے ذریعے ریپبلک بھی قائم ہو۔ امید کی شعاع، جرأت کی کرن انسانی دل میں نہ صرف خالی جگہیں بھرتی ہے بلکہ اپنے لیے نئی جگہ بھی بناتی ہے۔ ہیروازم آ جاتا ہے۔ سچا کاز تو ناقابلِ بیاں قوت رکھتا ہے۔ ایک غیر ملک کی افواج کا دوسرے ملک میں گھسنا اور آگے بڑھتے رہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے مگر وہی تو جگہ ہوتی ہے جہاں 'توسیع پسندی' کے تصور کو کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ سماجی بیماری جتنی قریب آتی ہے، سماجی علاج کی ضرورتیں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں۔ اور حتمی فتح تو سماجی علاج ہی کی ہوتی ہے۔ بروقت سماجی علاج شیطان کی شکست ہوا کرتا ہے۔ پین امریکی افواج کی بہادرانہ پیش قدمیوں کو دلیل مہیا کرتا ہے، جواز عطا کرتا ہے۔ وہ جارج واشنگٹن کی جینز کی کاپیاں بناتا ہے اور اُسے ہر امریکی کے دل کے ہر خلیے کے نیوکلیئس میں انجیکٹ کرتا ہے۔ یوں وہ، ہر امریکی کو واشنگٹن کی طرح سوچنے پر لگا دیتا ہے۔

جاری جنگ میں برطانیہ کا پلہ بھاری ہے۔ اس کی پیش قدمی جاری ساری ہے۔ ٹام پین، فلیڈیلفیا شہر کو دشمن کے قبضے میں آنے نہ دینے کے لیے اپنا سارا تخلیقی زور لگاتا ہے۔ وہ نظریاتی عسکری ہر دلیل اور طریقہ لکھتا ہے جس سے شہر کو بچایا جا سکے۔ وہ دوسری پڑوسی امریکی سپاہِ آزادی کے تذکرے کر کر کے اپنے لوگوں کی ہمت بڑھاتا ہے۔ اس کا یہ پمفلٹ بلاشبہ جنگِ آزادی کا ایک مینوئل لگتا ہے۔ وہ اپنی ناکامیوں کو بہت چھوٹا قرار دیتا ہے اور کامیابیوں کو خدا کی ایسی نعمت

گردانتا ہے کہ مایوسی اور شکست خوردگی والی کیفیت پیچھے دور چلی جائے۔

وہ اس پمفلٹ کو دشمن غاصب فوج کے کمانڈر کو مخاطب کر کے ختم کرتا ہے۔ وہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ محض اپنی شکست کے وقت کو طول دے رہا ہے۔ اگلا وقت اُس کے مصائب کو گہرا بھی بناتا جائے گا اور تیز رفتار بھی۔ بربادی کی طرف رواں دواں، تباہی کی ضیافت کے لیے کمر بستہ۔ ٹام، حب الوطنی کی طاقت کو کسی قابض بادشاہ کے چہرے پہ وقتی مسکراہٹ کو ابدی پشیمانی میں بدلنے کے لیے حتمی سمجھتا ہے۔ غلام بنانے کی خواہش آزادی کے جذبے کے سامنے بہت حقیر ہوتی ہے۔ ایماندار انسانوں کے زندہ رہنے کے لیے زمین کا ٹکڑا بچائے رکھنا ہزار درجہ افضل ہے، حریص توسیع پسند کے قبضہ کرنے کی حرکتوں سے۔ ’اے جارح افواج کے کمانڈر! مایوسی ہی تمہارا دکھ بھرا ہتھیار رہے گی‘۔

اُسے اندازہ ہے کہ آزادی پسند افواج اس بحران میں تعداد میں کم ہوں گے۔ مگر وہ بجا طور پر جانتا ہے کہ جو لوگ اس کاز میں کھڑے رہیں گے، وہ انسانوں کی محبت اور شکریے کے مستحق رہیں گے۔ وہ اپنے لوگوں کو بتاتا ہے کہ استبدادی قوت پر آسانی سے فتح نہیں پایا جاسکتا مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ تصادم جس قدر سخت ہو گا فتح اسی قدر شاندار ہو گی۔ جو چیز سستی ملتی ہو اسے ہم بہت بے قدری سے لیتے ہیں۔ برطانیہ نے امریکہ میں، اور بعد میں ایشیا کے اندر اپنی استبدادیت کو ایک فوج کے ذریعے مسلط رکھنے کا فیصلہ کیا، پین یہاں اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ خدا عوام کی مدد ضرور کرے گا۔ وہ کبھی بھی انسان کو شیطانوں کے حوالے نہیں رکھتا۔ ’خدا برطانیہ کے بادشاہ کا ساتھ نہیں دے گا جو ہم پر قابض ہے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ ایک عام قاتل، ایک ڈاکو، ایک راہزن کا ساتھ نہیں دیتا‘۔ وہ پندرھویں صدی میں جون آف آرک کے فرانس کی مثال دیتا ہے کہ کس طرح اس نے شکست خوردہ بکھری فوجوں کو جمع کر کے قابض برطانوی فوجوں کو نکال باہر کر دیا تھا۔

ٹام پین یہاں دلاویرنامی ایک محاذ کا تذکرہ کرتا ہے، جہاں وہ خود سپاہِ آزادی کے شانہ بشانہ لڑتا رہا۔ وہ اس محاذ کی کامیابیوں ناکامیوں کی وجوہات مکمل فوجی انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی افواج کے لوگوں اور کمانڈروں کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اسی طرح وہ دشمن افواج کے

کمانڈر کی خصلتیں وضاحت کے ساتھ دکھاتا ہے۔ وہ غیر ملکی حکمرانوں کے ہر طرف دار امریکی کو بزدل گردانتا ہے، اسے غلامانہ خصلتوں والا، خود غرض، خوف کا مارا، ظالم، حقیر اصولوں والا کہتا ہے۔ وہ بہت ہی واعظانہ انداز میں عام مثالیں دے کر اپنے لوگوں کی ہمت بڑھاتا ہے۔ وہ مشکل حالات میں مسکرانے والے سے محبت کرتا ہے۔ اُس سے محبت کرتا ہے جو بے آرامی میں قوت مجتمع کر سکتا ہے۔ وہ اس چور کو معافی کے قابل نہیں سمجھتا جو کہ کسی کے گھر گھس جائے، اس کی ملکیت کو تباہ کرے، جلائے اور گھر کے افراد کو قتل کرنے کی دھمکی دے۔ وہ خواہ بادشاہ ہو یا عام آدمی، ہم وطن ہو یا غیر، خواہ وہ ایک شخص ہو یا افواج کا مالک۔ پین، لومڑی کی مکاری اور بھیڑیے کے تشدد دونوں کو مہلک قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف خبردار رہنے کا کہتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ایک سامراجی قوت ہمیشہ ساتھ ساتھ چلاتی ہے۔ لالچ اور خوف، دونوں نوآبادکار کے ہتھکنڈے ہیں۔ پین، آفاقی فارمولا وہیں مقامی حالات و مقامات سے اخذ کرتا ہے اور وہیں اس کا اطلاق کرتا ہے۔ وہ علم کو عمل میں ڈھالتا ہے اور عمل سے علم کشید کرتا ہے۔ وہ مقامی رہتے ہوئے مقامی ندی نالوں والا رہتا ہے۔ لڑتا ہوا، لکھتا ہوا، آگے بڑھتا ہوا، بولتا ہوا، پسپا ہوتا ہوا، امید بڑھاتا ہوا۔

صرف یہی نہیں وہ تو راشن و سپلائی کی صورت حال پر بھی مفصل بحث کرتا ہے، اپنی اور دشمن کی سپاہ کی تھکاوٹ و تراوٹ جانچتا ہے۔ جنگی نقشے اور منصوبے پہ بولتا ہے، مورچوں کی باتیں، کھائیوں، خندقوں، اور پہاڑیوں کی باتیں کرتا ہے۔ وہ بہ یک وقت ایک ملٹری مین بھی ہوتا ہے اور ایک فلاسفر و سیاستدان بھی۔ یہ شخص غلامی سے نفرت کرتا ہے مگر غلامی کے ساتھ جب ناامیدی بھی شامل ہو جائے تو وہ نفرت سے بپھر جاتا ہے۔ پین، اپنے آپ میں ایک مظہر ہے!۔

یہ اتنا پاک، اتنا مؤثر پمفلٹ ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی کا سربراہ جنرل جارج واشنگٹن اپنے سپاہیوں کے درمیان بیٹھ کر اسے زور زور سے پڑھتا تھا۔ ہر قسط فوج کے پڑاؤ میں گردش کرتی تھی، آگ کے قریب بیٹھے سپاہی اسے پڑھتے تھے، یا ایک پڑھتا جاتا تھا باقی سنتے۔ وہ خوب متاثر ہوتے، اور ان کا مورال بلند ہوتا۔

ٹام پین سارا سارا دن تو فوجوں کے ساتھ مارچ کرتا تھا اور رات کو آرام کرنے کے بجائے

کیمپ فائر کی روشنی میں لکھتا رہتا۔ امریکی بحران نمبر ایک، 19 دسمبر 1776 میں چھپا۔ امریکی بحران سلسلے کا اگلا کتابچہ اگلے ہی ماہ یعنی 13 جنوری 1777 کو نکلا۔

’بحران‘ نامی اس پمفلٹ کو اِس مشہورِ زمانہ فقرے سے شروع کیا گیا: ’’یہ وہ زمانے ہیں جو انسانوں کی ارواح کی آزمائش کرتے ہیں‘‘۔ پمفلٹ کیا تھا؛ ایک جنگی مینوئل تھا، منشورِ آزادی اور لائحہ عمل تھا۔ اس قدر اثر دار کہ واشنگٹن نے حکم دیا کہ اس پمفلٹ کو اس کی افواج کے سارے سپاہیوں میں پڑھا جائے۔

اس کتابچے میں وہ امریکی جنگِ آزادی کے پس منظر میں حکمرانوں کے ایک فرمان کا مدلل جواب لکھتا ہے۔ پین نے ’بحران‘ نامی اپنی تصنیف کو جابر حکمران کے فرمان کے مقابل کھڑا کر دیا۔ پین بنی نوعِ انسان کا آدمی ہے۔ وہ کوئی کمانڈر نہیں ہے مگر پھر بھی انسانوں کی ڈیوٹیاں لگاتا جاتا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ ریپلک نامی لفظ، بادشاہت سے زیادہ قدیم ہے۔ بادشاہت ایک سڑاند ہے۔ یہ انسانوں کو خاک سے بھی نیچے گرا دیتی ہے۔ اُس کی نظر میں باغی دراصل وہ ہوتا ہے جو عقل کا، عقلیت کا، عقلیت پسندی کا اور خرد افروزی کا باغی ہوتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ دونوں میں سے ایک کو گرنا ہے۔ غلامی کو بہر حال ٹوٹنا ہے، امریکہ کو بہر حال آزادی ملنی ہے۔ نوآبادیت کا مقصد تو قتل کرنا، فتح کرنا، لوٹنا اور غلام بنانا ہوتا ہے۔ ’سامراجی حکمران کی روزانہ نیند اور جاگ خود پر ہزاروں لعنتوں کے ساتھ شروع ہوتی ہے‘۔ برے کاز کی حمایت ہمیشہ برے لوگ کرتے ہیں اور برے طریقے سے کرتے ہیں۔ انفرادی گناہوں کی سزا تو قیامت تک ملتوی ہوسکتی ہے مگر قومی گناہوں کی سزا یہیں اسی دنیا میں ملتی ہے۔ جو شخص اپنا پیدائشی حق ذرا سے نمک کے لیے بیچ ڈالے، اتنا ہی حقیر ہے جتنا کہ وہ آدمی جس نے اسے بغیر نمک والی ترکاری پر فروخت کیا۔ نمک اور شکر اور زیبائش کیا ہیں؟ ’آزادی اور سلامتی‘ کی ناقابلِ تخمینہ نعمتوں کے سامنے کیا ہیں یہ؟ اُس کا یہ اچھا فقرہ بھی پڑھیے: ’جنگ میں آرام کرسیاں نہیں ہوتیں‘۔ دوسری قوم کو غلام بنانا ایک قومی جرم ہوتا ہے، برطانیہ کو آلام کے دنوں سے گزرنا ہوگا۔

ٹام پین اس حقیقت سے خبردار بھی کرتا ہے کہ جنگِ آزادی اپنے نقصانات تو ساتھ لاتی ہی ہے۔ اور: ’ہمارے ملک کو کافی نقصان ہوگا اور ہمیں اس کی توقع ہونی چاہیے‘۔

ٹام لڑتا بھی جاتا ہے، لکھتا بھی جاتا ہے۔ اور ہر دستیاب موقعے پر سپاہیوں سے باتیں بھی کرتا جاتا ہے۔ گروہ ملے یا ایک سپاہی، ٹام وہاں گھل مل جاتا۔ کوئی تصنع کیے بغیر، کوئی بناوٹ، دکھاوا دکھائے بغیر وہ اس سے ڈائریکٹ گفتگو کرتا۔ کوئی فلسفہ نہیں، کوئی صرف ونحو نہیں، بس سیدھا دل کی بات۔ حقائق بیان کر کے ہر طرح کے فیصلے کے لیے مخاطب کو آزاد چھوڑتا۔ پے در پے شکستوں میں چڑچڑا سپاہی معمولی بات پہ دوسرے کا گلا کاٹنے کو تلا بیٹھا ہوتا ہے۔ مگر یہ جادوگر ٹام اس سے گھنٹوں باتیں کرتا سنتا، روتا، ہنستا۔ وہ بھی تو شکست کا مالک تھا۔ اُس کی بھی روح کا ایک ایک ریشہ دکھوں سے ریش ریش تھا۔ دو دکھی دو شکست خوردہ کتھارسس کا سامان کرتے۔ گفتگو کرتے ...... اور اگلی مدبھیڑ کے لیے تیار ہو جاتے، بغیر چڑچڑے پن کے، بغیر گروہ بندی کے۔ اس کی تکریم اور مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ مگر نہ تو اِس عوامی تکریم میں کوئی مصنوعیت ہوتی ہے نہ اُس کی مقبولیت میں کوئی تصنع اور ریاکاری ہوتی ہے۔ ایک بے ساختہ کامریڈشپ، ایک قدرتی پیار و احترام جو صرف آنکھوں کی چمک اور گرم جوش مصافحوں سے نظر آتا ہے۔

اس دوران 1777 میں کانگریس نے اُسے خارجہ امور کی کمیٹی کا سیکریٹری لگایا۔ اس نے 1779 تک اسی عہدے پر بہت محنت سے کام کیا۔

امریکی بحران نامی اگلا پمفلٹ 21 مارچ 1778 میں چھپا۔ یہ پمفلٹ امریکی نوآبادی میں متعین ایک برطانوی، نوآبادکار ذہنیت کے فوجی افسر، جنرل سر ولیم ہارے سے مباحثے کے سلسلے میں لکھا گیا۔ اس سامراجی افسر نے عقل پسندی کے استعمال اور اتھارٹی پر اعتراض کیا تھا۔ ٹام پین کیسے اور کیوں خاموش رہتا؟۔ وہ تو اس فوجی افسر کو دلیلوں، نظیروں کے کوڑے مارنے لگتا ہے۔ وہ اس کی فاتحانہ ڈینگوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ وہ اُس کی ہلکی باتوں کو ’مردے کو دوا پلانے‘ کا کام گردانتا ہے۔ وہ اُسے محسوس کرنے اور تفکر کرنے سے مجذوب کہتا ہے جو کہ جانوروں والی حالت ہوتی ہے۔ وہ اُسے احمق بادشاہ کا نوکر قرار دیتا ہے۔ اُس کے وقار کو ’مرحوم‘ قرار دیتا ہے، اور اسے حقیر اور بازاری فراڈیوں کا سرپرست قرار دیتا ہے۔

ٹام پین برطانیہ کو ایک غلام و محکوم بنانے والا ملک کہتا ہے۔ اور وہ ساری عمومی برائیاں

مفصل بیان کرتا ہے جو دوسری قوموں کو غلام بنانے والے ملک کے سماج کا مقدر ہوتے ہیں۔ غلام قوم کی نظروں سے وہ آقا قوم کی ہر برائی کو فطری طور پر بہت واضح طور پر دیکھتا ہے: مالی کرپشن کو، اخلاقی گراوٹ کو، بے انصافی اور ظلم کو، بادشاہت کو.........وہ جنگِ آزادی کی اب تک کی صورت حال پر بہت تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ ایک ایک تفصیل۔ بلاشبہ پین امریکی جنگِ آزادی کا 'گدّ ومری' ہے۔ ایک جنگی رپورٹر اور نامہ نگار، جو کہ انتہائی جانب دار ہے، آزادی کے حق میں۔ ٹام سپاہِ آزادی کی ہر کمی کمزوری اور ہر فتح و کامیابی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ پُریقین، پُر امید پین۔ اِس پمفلٹ کے اندر جنگ میں اب تک لڑی جانے والی ہر لڑائی پر مفصل تجزیہ موجود ہے۔

اس پمفلٹ کی شروعات اور اس کا آخری پیراگراف ادبی شاہکار ہیں، نظریاتی ٹکڑے ہیں، سیاسی اقوالِ زریں ہیں۔ برطانوی نژاد اور امریکی سپاہِ آزادی کا ساتھی ٹام پین، امریکہ پر قبضہ کرنے والی برطانوی فوج کے اِس افسر کو 'ازطرف' والے آخری حصے میں یوں لکھتا ہے:

''تمہارا دوست، دشمن اور ہم وطن''۔

جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا، ٹام پین صرف لکھتا نہ تھا بلکہ وہ تو عملی طور پر امریکہ کی تحریک آزادی کی لڑائی میں شامل تھا۔ انقلابی جنگ میں وہ اہم جنرل گرین کے معتمد کے بطور شامل تھا۔

اسی سال پچھلے پمفلٹ سے آٹھ ماہ بعد یعنی 21 نومبر 1778 کے امریکی بحران نامی پمفلٹ میں وہ برطانوی عوام سے مخاطب ہوتا ہے۔ وہ برطانوی عوام سے امریکہ پر اُن کے مکمل قبضے میں ناکامی کی وجوہات پوچھتا ہے۔ سامراجی برطانیہ سمجھتا ہے کہ اس کی قوت خدا کی قوت جتنی ہے، اس کی سیاست بجائے مہذب بنانے کے انسانیت کو زخمی زخمی کر دینے والی ہے۔ اس کے مظالم کو کبھی بھلایا نہ جاسکے گا.........'جب اطلاع روک دی جاتی ہے تو جہالت ایک قابلِ جواز بہانہ بن جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ برطانیہ کے عوام اپنی مرضی سے ظلم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے بلکہ غلطی سے ایسا کرتے ہیں'۔ پین کی یہ تشخیص ہر سامراج کے لیے سو فیصد درست ہے کہ، ''سامراجی ملک کے عوام اسی چیز پر بھروسہ کرتے ہیں جو اُن کے حکمران انہیں بتاتے ہیں۔ انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ، اُن کے جرنیل دوسری قوموں کے جرنیلوں سے مختلف ہوتے ہیں''۔ نام نہاد قومی

وقار کا لفظ ہی جنگوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ لفظ کردار کے خاتمے کی علامت ہے۔ سامراج ہمیشہ بے پالش اور کھردرا ہوتا ہے۔ سامراج کی 'عظمت' اس کے عوام کی خاموشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مقبوضہ ملک کی آزادی، قابض عوام کے مفاد میں ہے۔

پین بہت وزنی دلائل کے ساتھ برطانوی عوام کو امریکی جنگِ آزادی کی حمایت کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر فقرہ ایک مصرع، ہر جملہ ایک کوٹیشن، ہر پیراگراف ایک ادبی شاہکار............ میں حیران ہوتا ہوں کہ ویتنام، امریکہ سے اتنا عرصہ لڑتا رہا مگر کسی نے جنگِ آزادی کے استاد ٹام پین کو نہیں پڑھا تھا، نہ اُن کے کسی راہنما نے اپنی تحریروں میں اُس کا کوئی حوالہ دیا۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے خطے میں قومی تحریکوں کی صفوں میں 'بے سمت' فرانز فینن کو تو مشہور کر لیا گیا مگر 'کارآمد' ٹام پین کو نظرانداز کر دیا گیا۔

ٹام پین کو دو نومبر 1779 کو پنسلوانیا کی جنرل اسمبلی میں کلرک بنا دیا گیا۔ یہاں سپاہیوں کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ پین نے اس پیسے کے بندوبست کے لیے بہت کوشش کی اور حتیٰ کہ وہ فنڈ جمع کرنے کے لیے فرانس چلا گیا۔ وہاں سے وہ کامیابی کے ساتھ چھ ملین کے تحفے میں سے چاندی کی صورت 2.6 ملین لیورز اور دس ملین قرض لے آیا، کپڑے، اور ہتھیار لایا جو انقلاب کی آخری کامیابی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔

1780 میں اس نے عوامی بھتری نامی پمفلٹ لکھا۔ اگلے سال نیویارک ریاست نے اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے نیوروچیلی میں ایک جاگیر دے دی۔

مارچ 1780 کے امریکی بحران میں وہ ایک بار پھر براہِ راست انگلینڈ کے عوام سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور انہیں جنگ بندی کے معاہدے کا کہتا ہے۔ وہ امریکی عوام پر برطانوی حکومت کے مظالم اور ناروائیوں پہ اُن کی بے خبری پہ کڑھتا ہے۔ وہ اُن کی فوجوں کے ہاتھوں ٹھٹھراتی سردی میں امریکی عورتوں بچوں کو دربدر بھٹکتے نہیں دیکھ پاتا جن کے بنے بنائے گھروں کو کھنڈر بنا دیا گیا۔ وہ برطانوی عوام کی طرف سے اپنی حکومت کو جنگی ٹیکس پہ ٹیکس دیتے رہنے پہ کڑھتا ہے۔

ٹام پین امریکی عوام کی آخری فتح کی امید کے لیے، اُن کے کاز کے برحق ہونے کو مستقل

چشمہ قرار دیتا ہے۔مگر جب امریکی عوام کی مصیبتیں انگریز عوام کی بن جائیں گی اور حملہ،حملہ آوروں کی طرف منتقل ہوجائے گا تو برطانوی عوام کے پاس تو کوئی امید، کوئی اطمینان دِہ بات نہ ہوگی۔خدا اُن کو سزا بھگتنے کے لیے چھوڑ دے گا۔آیئے اس کا یہ زریں قول دیکھیے:''ابھی سے دوسروں کا مقدمہ اپنا بنایئے اور اپنا معاملہ دوسروں کا،تبھی ساری بات سمجھ آئے گی''۔اس نے برطانوی عوام کو خبردار کیا کہ''جب جنگ ختم ہوگی تو تمہیں اپنی مقروضی اور بدبختیوں کا اندازہ ہوگا۔تم اپنے بیمار دماغوں کے ساتھ کوئی لطف نہ اٹھا سکو گے۔درد بڑھتا ہی رہے گا۔''

5مارچ 1782 کو جو امریکی بحران لکھا تو وہ" بادشاہِ انگلستان کی تقریر پر" کا عنوان پا گیا۔وہ بہت فلسفیانہ انداز میں لفظ 'تعجب' کے بارے میں بیان کرتا ہے۔تعجب ہے کہ قابض انگلینڈ کا بادشاہ تقریر کرے اور محکوم و مغلوب امریکی لوگ اسے ایک مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتے ہیں،ایک ہنسی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور حقارت کے ساتھ اُسے مسترد کرتے ہیں۔پین یہاں قبضہ گر کے لیے' عادی مکار' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔آگے چل کر اس پمفلٹ میں اُس نے جنگی صورت میں معیشت کا تفصیلی جائزہ لیا۔

31 مئی 1782 والے کتابچہ کا عنوان ہے؛خبروں کی موجودہ صورت۔یہ ایک طرح سے اُن دنوں چھپنے والی خبروں پر تبصرہ ہے۔سامراجی برطانوی قبضہ گروں کے بارے میں ایک دو اچھے فقرے آپ بھی پڑھیں:

''ہر مہم نے اُن کے نقصان میں اضافہ کیا اور ہر سال نے ان کی توہین میں۔''

''......کیا تم ہمیں ہمارے مرے ہوئے پیارے واپس دلا سکو گے؟ کیا تم ہماری یاد داشتوں سے اُن کو کھرچ کر نکال سکتے ہو،جو اب زندہ نہیں ہیں؟''۔

''دنیا اور برطانیہ کو خبر ہو کہ ہمیں نہ تو خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی بیچا جا سکتا ہے۔''

29 اکتوبر 1782 کے امریکی بحران میں ٹام پین،شیلبرن کے نواب سے مخاطب ہوا،جس کی تقریر اخبارات میں چھپی تھی۔اُس زمانے کے لوگوں اور وہاں بحث و مباحثہ کا حصہ حذف

کرتے ہوئے ہم صرف وہ حصہ چھیڑیں گے جہاں آج کے قارئین کو دلچسپی ہو۔ٹام لکھتا ہے کہ''امریکہ کی آزادی انگلینڈ کے کھنڈرات پہ قائم ہوگی......ایک حکومت کا گناہ پورے ملک کا گناہ ہوتا ہے...... کچھ معاملات میں کردار کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح کہ مردے کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔انگلینڈ کا گناہ امریکہ کے دل پہ اس زور سے لگا کہ فطرت نے ہماری طاقت میں یہ رکھا ہی نہیں کہ معاف کرنے کا کہہ سکیں..........''

19 اپریل 1783 کے کتابچے کا ذیلی عنوان ہے:امن پر غور و فکر اور اس کے ممکنہ فوائد۔اس کی ابتدا وہ اپنے معروف فقرے سے کرتا ہے:'یہ وہ زمانے ہیں جو انسانوں کی ارواح کی آزمائش کرتے ہیں'..........وہ ایک جگہ لکھتا ہے:''وہ ختم ہو چکے ہیں اور دنیا میں اب تک کا سب سے عظیم اور مکمل انقلاب شان اور مسرت سے مکمل ہو گیا۔مگر اس انقلاب کی حاصلات اس قدر سبک رفتار نہیں ہوتیں''۔اِس انقلاب کا بانی تھامس پین کہتا ہے:''ایک عمدہ قومی ساکھ اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنا کہ آزادی''۔

اس کتابچے میں ٹام نے اپنے بارے میں کچھ الفاظ کہے۔انہیں یہاں دہرانے سے امریکی انقلاب میں اُس کی خدمات اور اُس کی نیت پر کافی روشنی پڑتی ہے؛''میری کوششیں یہ رہی ہیں:ان سب کی سمت محبتوں کو مجتمع کرنا،مفادات کو متحد کرنا،اور ملک کے ذہن کو کھینچ کر اکٹھا کرنا اور اکٹھا رکھنا......اور انقلاب کے اس بنیاد ڈالنے والے کام میں،بہتر طور پر مدد دینے کی خاطر میں نے پیسہ اور عہدہ کے تمام مقامات سے گریز کیا،خود کو تمام پارٹیوں اور پارٹی روابط سے دور رکھا اور حتیٰ کہ ساری نجی اور ادنیٰ باتوں کی پرواہ نہ کی..........مجھے امریکہ کے کاز نے مصنف بنا دیا......''۔

اِدھر پین کا ایک اور موڑ سامنے آجاتا ہے؛''..........اب جب کہ جنگی مناظر بند ہو چکے، اور ہر شخص گھر اور پُرمسرت اوقات کے لیے تیار ہو رہا ہے،لہٰذا میں اس موضوع سے اجازت لیتا ہوں۔میں نے شروع سے آخر تک،اور بعدازاں خواہ میں جس بھی ملک میں ہوں گا میں نے اس میں جو حصہ لیا،اس پر میں ہمیشہ دیانتدارانہ فخر محسوس کروں گا اور میں فطرت اور پروردگار کا احسان مند ہوں کہ اس نے مجھ کو انسانیت کے کسی کام آنے کی قوت دی۔''

ٹام پین کو امریکی انقلاب سے زندگی بھر توقعات رہیں۔ وہ اس انقلاب کو وہ چھوٹی سی موم بتی قرار دیتا رہا جو ایک شعلہ بن کر ایک دوامی مشعل کی حیثیت اختیار کرے گا۔ یہ پیغام ایک قوم سے دوسری تک انتہائی خاموشی اور غیر محسوس طور پر پہنچتا جائے گا۔

1776 میں بوسٹن کا علاقہ برطانیہ کے ہاتھ سے چلا گیا۔ 1778 میں فرانس امریکہ کے اتحادی کے بطور برطانیہ کے خلاف جنگ میں شامل ہوا۔ یوں جنگ آزادی میں امریکی عوام کو فتح ہوئی، اور آزادی حاصل کی گئی۔ 1783 میں برطانیہ اور امریکہ میں معاہدہ ہوا اور امریکہ مکمل طور پر آزاد ہوا۔ یورپ بھر میں موجود شاہی نظام کے برعکس امریکہ ریپبلک بنا۔ یوں ایک الیکشن والی حکومت قائم ہوگئی۔

پین، انگلینڈ میں

تھامس پین کمال آدمی تھا۔ اب امریکہ میں انقلاب آ چکا تھا۔ وہ اتنے بڑے انقلاب کا 'باپ' کہلائے جانے کا مستحق اور حقدار تھا۔ کانگریس نے بھی نیویارک ریاست میں اُسے ایک فارم ہاؤس دیا تھا تاکہ وہ امریکہ میں آباد ہو کر زندگی گزار سکے، وہاں کاروبار اور شادی کر سکے اور امریکہ کے بانی بزرگوں میں شمار ہو سکے۔

مگر اُس نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ جب امریکی آزادی کا حصول ہو چکا تو اُس چے گویرا کو مزید وہاں رہنا کارآمد نہیں لگا۔ اب ذاتی روٹی روزگار اُس کے لیے اہم نہ رہا۔ وہ تو اب مکمل طور پر ایک تبدیل شدہ انسان تھا: ایک ہمہ وقت انقلابی۔ اُس کی انقلابی روح دنیا کے دوسرے ممالک میں زنجیر بندھے ذہنوں جسموں کو آزادی دلانے کو بے قرار تھی۔

چنانچہ ستمبر 1787 میں جب برطانوی قابض فوجوں نے اپنی شکست اور امریکہ کی آزادی تسلیم کر لی، اور جارج واشنگٹن امریکہ کا صدر بنا تو پین نے امریکہ چھوڑ دیا۔ وہ واپس اپنے آبائی وطن (؟) انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں انقلاب کے پودے کی آبیاری جو کرنا تھی۔ انقلاب تو اُس کا پیشہ تھا۔ امریکہ میں تو وہ اب 'بے پیشہ' ہو گیا تھا۔

ٹام پین کا والد تو اُسی دوران فوت ہو گیا تھا جب پین امریکہ کی آزادی جنگ لڑ رہا تھا۔

مگر، اب اُس کی نوے سالہ بوڑھی ماں تھی جس کی دیکھ بھال سے وہ اب تک بے خبر رہا تھا۔ چنانچہ وہ انگلینڈ گیا۔ اپنے پرانے تھیٹ فورڈ۔.........مگر ٹریجڈی دیکھیے کہ اس کی معمر ماں اب اُسے پہچاننے کے قابل نہ رہی تھی۔ آہ، نظر تھی تو نظارے نہ تھے، نظارے ملے تو نظر گئی!۔

مگر، اپنے مشن کی خاطر انگلینڈ اُس کے لیے بہت کارآمد مورچہ ثابت نہیں ہوا۔ ایک بات تو یہ تھی کہ اب وہ اُس قدر جوان نہ رہا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگلینڈ، امریکہ سے بالکل الگ اور ایک مختلف ملک تھا۔ یہاں تو کوئی امریکی انقلابی نہ تھے جنھوں نے کسی برطانیہ کے خلاف ہتھیار اٹھا رکھے ہوں۔ یہ ملک آزاد تھا، اور معاشی طور پر خوشحال بھی۔ اس لیے یہاں کے عوام کے تضادات ہی اور تھے۔ یہاں تو اُس نے کوئی اور ''کامن سینس''، کوئی اور ''بحران'' لکھنا تھا...... انگلینڈ کا بحران، وہاں کا کامن سینس۔

دوسری بات یہ تھی کہ یہاں اُس کے مخالفین اُس کی آمد سے پہلے ہی منظّم ہو چکے تھے۔ اہلِ سیاست سے لے کر اہلِ قلم تک انقلاب دشمنی مکمل طور پر صف بند اور منظّم تھی۔ ہر جگہ اُسے منہ کی کھانا پڑ رہی تھی۔ وہ نئی سے نئی حکمتِ عملی بنانے پر غور و خوض کرتا رہا۔

اسی زمانے میں ایک اور ملک میں ایک بہت بڑا واقعہ ہوا جس نے اُس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ اُس ملک کا نام تھا: فرانس۔

فرانس ہمیشہ سے یورپ کا ایک حیرت انگیز ملک رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک وہاں کے تاجر، مینوفیکچرر اور پیشہ ور لوگ حد سے زیادہ دولت مند بن چکے تھے۔ انھیں 'بورژوازی' کہا جاتا تھا (یہ لفظ بعد میں مارکسزم میں بہت مشہور ہوا)۔ مگر دوسری طرف وہاں کسانوں کی بدحالی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُن کے لیے فیوڈل نظام کو مزید سہارا دینا ناممکن ہوا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فرانس امریکی انقلاب میں شریک رہا تھا۔ فرانس کے بادشاہ نے امریکہ میں جاری برطانیہ مخالف جنگِ آزادی کو خوب مالی امداد دی تھی۔ اور بے انتہا کمک روانہ کر دی تھی۔ اتنا زیادہ کہ اُس کی وجہ سے وہ ملک دیوالیہ پن کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ پھر 1788 میں وہاں ایک طویل قحط سالی آئی جس سے پہلے سے مصیبت میں گھرے عوام مزید معاشی مشکلات میں گرفتار ہوئے۔ اس ساری صورت حال

سے لوگ تنگ آ چکے تھے۔ ایک بڑی بے چینی پیدا ہوئی۔ دانش وروں فلاسفروں نے اس صورت حال کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ وہ بڑے پیمانے کی سیاسی سماجی اصلاحات چاہتے تھے۔ ایسے دانش ور و فلاسفر بہت مقبول ہوئے اور انہیں زیادہ سے زیادہ پڑھا جانے لگا۔

'انقلابِ فرانس' مئی 1789 میں اسٹیٹ جنرل کے کانوکیشن سے شروع ہوا۔ انقلاب کے پہلے سال تھرڈ اسٹیٹ کے ممبروں نے جون میں ٹینس کورٹ کا اعلان کر دیا۔ 14 جولائی 1789 کو عوام الناس کے ہجوم نے بادشاہت کے ظلم کے سب سے بڑے نشان باستیلی پر قبضہ کر لیا۔ کسان جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اشرافیہ اور بورژوازی بھاگنے لگی۔ چار اگست 1789 کو فیوڈل رجیم کے خاتمے کا فرمان جاری ہوا۔ 26 اگست کو انسان اور شہری کے حقوق کا اعلان ہوا جس میں لبرٹی، شہری حقوق اور برابری کی ضمانت دی گئی۔ بادشاہ عوامی خوف کی وجہ سے پیرس سے ورسلیز نامی محفوظ مقام پر منتقل ہو چکا تھا۔ اُس نے ان دونوں اعلانات کی منظوری نہیں دی۔ تب پیرسی دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے اور 5 اکتوبر کو ورسلیز تک مارچ کیا۔ اگلے دن وہ شاہی خاندان اور دربار کو دوبارہ پیرس لائے۔

درجنوں اخبار نکلے، سنسر کو بادشاہی نظام کے منہ پر دے مارا گیا۔ ایک قومی آئین ساز اسمبلی بنی جس نے پرانے رجیم کا صفایا کر دیا اور فرانس کو محکموں، ضلعوں، اور کمیونوں میں تقسیم کیا جن کی ساری انتظامیہ منتخب لوگوں پر مشتمل ہوئی۔ پادری اور اس کے چرچ کی ساری جاگیر ضبط کی گئی۔ پادریوں اور راہباؤں کو نجی زندگی کی طرف لوٹ جانے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایک آزاد ملک میں، روم کے بیٹھے پوپ کی بالادستی ختم کرنے کے لیے پادریوں سے ملکی آئین کی پاسداری کا حلف اٹھوایا گیا۔ اور جنھوں نے ایسا نہیں کیا ان کے خلاف قانون منظور ہوا: 'جلاوطن کرنے کا، یا انہیں بطور غدار سزائے موت دینے کا'۔ (یہ ساری اصطلاحات اور الفاظ بعد میں آنے والے بہت بڑے سیاسی معاشی نظریے یعنی مارکسزم نے اپنا لیے)۔

ٹام پین، انگلینڈ میں تھا۔ ایک بہت ہی قدامت پسند ملک میں جہاں اس کی طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔ یہاں تو بہت منظّم سرکار تھی۔ اس سرکار کے بہت منظّم اور باؤلے دانش ور تھے۔

ضیافتوں، دعوتوں میں اسے اندازہ ہوا کہ اُسے بہت کام کرنا ہے، بہت کچھ۔ اُس کی جاسوسی ہونے لگی۔ اُس کے دوستوں اور ملنے والوں کو تنگ کیا جانے لگا۔

اسی دوران ایڈمنڈ برکے (1729-1797) نامی ایک دانش ور نے ''فرانس میں انقلاب پر غور و فکر'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس نے اپنی اس تصنیف میں فرانسیسی عوام کے اس انقلابی ابھار کی مخالفت کی۔ اس نے لکھا کہ یہ انقلاب چند سازشی ذہنوں کا شاخسانہ ہے، جنہوں نے عوام کو برین واش کیا۔ اس نے نہ صرف فرانس کے انقلاب کے خلاف لکھا بلکہ پوری دنیا میں انقلاب کی مخالفت کی۔ وہ انسان کے بنیادی حقوق کا منکر تھا۔ اس نے انسان کی اہلیت، امید اور وقار پہ شک کیا۔

اُس کے مضمون سے پین کے ضمیر و روح کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ وہ انگلینڈ کے دانش وروں کی کوتاہ بینی سے تنگ آ چکا تھا۔ اُس کو تو پھر مورچہ سنبھالنے کے لیے للکار ملی۔..........اور وہ خدا سے یہی چاہتا تھا۔

انسان کے حقوق

پین نے برُکے کے جواب میں انتہائی سرعت کے ساتھ ایک کتابچہ **انسان کے حقوق** (مارچ 1791) لکھ ڈالا۔ اس کا انتساب اس نے جدوجہد کے اپنے ساتھی جارج واشنگٹن کے نام کیا۔

یہاں انگریزی ایڈیشن کے پیش لفظ میں اس نے لکھا کہ:

''......جس وقت پچھلے موسمِ سرما میں مسٹر برُکے نے برطانوی پارلیمنٹ میں انقلابِ فرانس کے خلاف پُرتشدد تقریر کی تو اُس وقت میں پیرس میں تھا.......... چونکہ یہ حملہ ایک ایسی زبان میں کیا گیا جو فرانس میں کم سمجھی جاتی ہے، تو میں نے اُس ملک میں انقلاب کے کچھ دوستوں سے وعدہ کیا کہ جب بھی مسٹر برکے کا پمفلٹ چھپ کے آ جائے گا تو میں اس کا جواب دوں گا۔ یہ کام کرنا مجھے بہت ضروری لگا اس لیے کہ میں نے وہ واضح توڑ مروڑ دیکھی جو مسٹر برکے کے پمفلٹ میں تھی، اور وہ انقلابِ فرانس اور آزادی کے اصولوں کو ایک غضب ناک گالی ہے''۔

پین بلاشبہ بڑا فلاسفر اور خوبصورت رائٹر تھا۔ مجھ سے اس پوری ضخیم کتاب کا ترجمہ تو نہ ہوسکا، نہ ہی اسے مکمل ترجمہ کرنا آج مناسب ہے۔ اس لیے کہ اُس زمانے کی معمولی تفصیلوں سے آج کے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا جاسکے گا۔ البتہ میں نے چیدہ چیدہ باتوں کو یہاں ترجمہ کیا ہے۔

ہاں، میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ وہ یہ کہ اگر آپ کو کوئی بات اچھی لگے تو یہ ضرور سمجھ رکھیں کہ اُس بڑے آدمی نے یہ بات آج نہیں بلکہ ڈھائی سو سال پہلے لکھی تھی۔

پین کو پڑھیے:

اقوام یا افراد جن بدتہذیبیوں سے ایک دوسرے کو اشتعال دلاتے ہیں یا جھنجلاتے ہیں، انقلابِ فرانس پر مسٹر بُرکے کا پمفلٹ اُن میں سے ایک ہے۔ نہ تو فرانس کے عوام نے اور نہ ہی وہاں کی قومی اسمبلی نے کبھی انگلینڈ یا برطانوی پارلیمنٹ کے معاملات میں مداخلت کی۔ پھر مسٹر بُرکے نے پارلیمنٹ اور پبلک میں اُن پہ بغیر کسی اشتعال کے کیوں حملہ کیا؟ یہ ایک ایسا رویہ ہے جس کو نہ تو ادب آداب کے میدان میں معاف کیا جاسکتا ہے، اور نہ سیاست کے میدان میں اُس کا جواز پیش کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان میں شاید ہی کوئی گالی بچی ہو جو مسٹر بُرکے نے فرانسیسی عوام اور ان کی قومی اسمبلی کو نہ دی ہو۔ جو کچھ عداوت، تعصب، جہالت یا علم سے ہوسکتا تھا، چار سو صفحوں کے لبریز غصے میں انڈیل دی گئی۔ جس دباؤ میں اور جس منصوبے سے مسٹر برکے لکھ رہا تھا، وہ کئی ہزار صفحے لکھ سکتا تھا۔ اس لیے کہ جب قلم یا زبان جذبے کی رَو میں رسیاں تڑوا کے کھل جائے، تو آدمی تو ختم ہو جاتا ہے، موضوع نہیں۔

مسٹر بُرکے کی کتاب فرانسیسی قوم کو ہدایات دینے کے بطور نظر آتی ہے۔ مسٹر برکے! یہ تو اندھیرے کا روشنی کو روشن کرنے کی کوشش کرنا لگتا ہے۔

مسٹر بُرکے لکھتا ہے کہ ''ہم نے ایک نرم اور قانونی بادشاہ کے خلاف فرانسیسی باغی کو ایسے غصے، وحشت اور توہین کرتے دیکھا جو دنیا نے کسی غیر قانونی ترین غاصب یا خونخوار ترین ظالم کے خلاف بھی نہ دیکھا''۔.......... یہ ہزاروں موقعوں میں سے ایک ہے جہاں مسٹر برکے بتاتا ہے کہ وہ انقلابِ فرانس کے سرچشموں اور اصولوں

سے ناواقف ہے۔

قوم نے لوئی شانزدہ کے خلاف نہیں، بلکہ حکومت کے استبدادی اصولوں کے خلاف بغاوت کی۔ ان اصولوں کی ابتدا بادشاہ میں نہ تھی بلکہ اصل میں اسٹیبلشمنٹ میں تھی، کئی صدیاں قبل۔ اور وہ اتنی گہری جڑیں رکھتے تھے کہ اکھاڑے نہیں جاسکتے تھے، اور جونکوں اور لٹیروں کا غلیظ اصطبل اس قدر گندا ہو چکا تھا کہ یہ ایک مکمل اور آفاقی انقلاب کے بغیر صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ جب کوئی چیز کرنی ضروری ہو جاتی ہے، تو سارا دل اور روح اس میں لگ جانے چاہئیں، یا تو پھر کوشش ہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بحران پہنچ چکا تھا۔ اس لیے یا تو بالکل کچھ بھی نہ کرنا تھا، یا پھر فیصلہ کن جوش کے ساتھ اقدام کرنا تھا۔

.... بادشاہ اور بادشاہت دو نمایاں اور الگ الگ چیزیں تھیں۔ انقلاب تو ثانی الذکر کے مضبوط جبر کے خلاف ابھرا تھا، نہ کہ اول الذکر کی ذات یا اصولوں کے خلاف

۔

......جب فرانس کی طرح، کسی ملک میں زمانوں سے آمریت قائم ہوتی ہے تو یہ صرف بادشاہ کی ذات میں نہیں ٹھہرتی۔ بہ ظاہر تو آمریت برائے نام اتھارٹی جیسا نظر آتی ہے مگر عمل اور حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ ہر دفتر اور محکمہ کی اپنی اپنی آمریت ہوتی ہے۔ ہر جگہ کا اپنا باستیلی ہوتا ہے، اور ہر باستیلی کا اپنا آمر۔ بادشاہ کے اندر رہائش پذیر اولین موروثی آمریت خود کو ہزاروں شکلوں اور صورتوں میں تقسیم در تقسیم کرتی ہے۔ فرانس میں یہی حالت تھی اور استبدادیت کے اس نوع کے خلاف، دفتر کی نا مختتم بھول بھلیوں میں سے آگے بڑھتے ہوئے درست کرنے کا کوئی طریقہ نہیں جب تک کہ اس کا سرچشمہ محسوس ہو۔ آمریت فرض کی صورت گری اختیار کر کے خود کو مضبوط بناتی ہے، اور فرمانبرداری کے دکھاوے سے جبر و استبداد کرتی ہے۔

موروثی آمرانہ حکمرانی کے تحت ایک ہزار آمریتیں ابھرتی ہیں۔ اور اس قدر گہری جڑیں

بناتی ہیں کہ پھر اُس سے بھی الگ اور آزادانہ آمریتیں بن جاتی ہیں۔شہنشاہیت ، پارلیمنٹ اور چرچ کے درمیان استبدادیت کی ایک رقابت تھی، فیوڈل استبدادیت مقامی طور پر کام کر رہی تھی، اور پادری کی استبدادیت ہر جگہ کام کر رہی تھی۔

ساتھ میں مقامی طور پر چلنے والا فیوڈل جبر و استبداد، اور ہر جگہ پر چلنے والی سرکاری استبداد۔مگر مسٹر بُرکے، صرف بادشاہ کو بغاوت کا شکار گردان کر بات کرتا ہے جیسے فرانس ایک گاؤں ہو جس میں جو چیز بھی ہو رہی ہو وہ اس کے کمانڈنگ افسر سے جانا جائے......

دوسرے یورپی ملکوں میں جو انقلابات آئے، انہیں شخصی نفرت نے بھڑکایا تھا۔غصہ شخص سے تھا، اور وہ شکار بنا۔مگر فرانس کے معاملے میں، ہم انسانی حقوق کے معقول تصور میں پیدا شدہ ایک انقلاب دیکھتے ہیں، اور شروع ہی سے اشخاص اور اصولوں کے بیچ فرق دیکھتے ہیں۔

مگر مسٹر برکے جب حکومتوں کو تصور کر رہا ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اصولوں کے تصور سے نابلد ہے۔وہ لکھتا ہے،’’دس سال قبل میں ایک حکومت رکھنے پر فرانس کی تعریف کرتا، یہ پوچھے بغیر کہ حکومت کی قسم کیا تھی یا یہ کس طرح چلتی تھی‘‘۔کیا یہ کسی معقول انسان کی زبان ہو سکتی ہے؟ ۔کیا یہ ایک محسوس کرنے والے دل کی زبان ہے جسے نسلِ انسان کی مسرت اور حقوق کے بارے میں احساس ہو؟ اسی وجہ سے مسٹر بُرکے کو دنیا میں ہر حکومت کی تعریف کرنی چاہیے، جبکہ ان کے تحت زندگی گزارنے والے خواہ دکھ اٹھائیں، خواہ بطور غلام بیچے جائیں، یا ٹارچر کر کر کے ان کا وجود ہی ختم ہو۔مسٹر برکے اقتدار کی عزت کرتا ہے نہ کہ اصول کی، اور اس نفرت انگیز کھوٹ کے تحت وہ اُن میں سے فیصلہ کرنے کا نااہل ہے۔

فرانس میں تو شخصیتیں نہیں تھیں، اصول تھے۔قوم کے ذہن پر ایک بلند تر ابھارنے والی چیز کام کر رہی تھی، اس لیے وہ ایک دشمن کے زوال کی بہ نسبت ایک بلند تر فتح کی

تلاش میں تھی۔اُن چند میں جو قتل ہوئے، ان میں سے ایسا کوئی نہ تھا جسے جان بوجھ کر خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔اُن سب کی تقدیریں اس گھڑی کی صورت حال پہ تھیں، اور ان کا طویل، خونی اور بلاتخفیف انتقام سے پیچھا نہیں کیا گیا۔

مسٹر بُرکے اِس ارسٹوکریٹی کے ہاتھ کو چومنے کا عادی ہے جس نے اُسے خود سے چرایا۔وہ آرٹ کی ایک آمیزش میں حقیر ہو جاتا ہے، اور فطرت کی اصل روح اسے ترک کر دیتی ہے۔اس کے ہیرو یا ہیروئن کو شو میں دم نکلنے والی ٹریجڈی کا شکار ہونا چاہیے، نہ کہ ایک تہہ خانے کی خاموشی میں موت کی طرف پھسلتے ہوئے دکھ کا اصل قیدی ہونا چاہیے۔

باستیلی پر قبضہ کے وقت اور دو دن پہلے اور دو دن بعد پیرس شہر نے جو ہیبت ناک منظر پیش کیا، اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔دور سے تو یہ کاروائی محض ہیروازم لگتا ہے، اور انقلاب کے ساتھ اس کا قریبی سیاسی تعلق فتح کی چمک میں گم ہو جاتا ہے۔باستیلی کو حملہ آوروں کے لیے یا تو انعام ہونا تھا یا جیل خانہ۔اس کا زوال استبداد کا زوال ہے۔

جب استبدادیت‘ استبدادیت سے جنگیں کر رہی تھی، تو عام آدمی کو مقابلے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس کی دلچسپی تو ایک ایسے کازِ حیات میں تھی جو سپاہی کو شہری سے جوڑے، اور قوم کو قوم سے۔بحث یہ ہے کہ کیا انسان اپنے پیدائشی حقوق پا سکے گا، اور کیا عالمی تمدن وقوع پذیر ہو گا؟ ۔جب ایک حکومت اپنے عوام کا تحفظ نہیں کرتی، ان کے فطری حقوق کا، اور ان کے قومی مفادات کا تحفظ نہیں کرتی تو پھر ایک مقبولِ عام سیاسی انقلاب جائز ہو جاتا ہے۔

مصنف نے عوام اور حکومت کو دو الگ الگ وجودیں قرار دیا۔اُس نے بتایا کہ دنیا کی ہر قوم انقلاب کے حق میں ہوتی ہے اور وہ دنیا بھر کی ترقی اور لبرٹی چاہتی ہے۔صرف حکومتیں ایسا نہیں چاہتیں۔اخبارات حکومتوں سے پیسہ لیتے ہیں، اس لیے وہ بھی انقلاب کے خلاف لکھتے ہیں۔(کمال ہے

،ایسا تین سو سال قبل بھی تھا!!)۔اس نے لکھا: ''میں جنگ کے بہت سارے دکھ دیکھ چکا ہوں۔اس قدر زیادہ کہ خواہش ہے کہ یہ دنیا میں موجود ہی نہ ہو اور پڑوسی قوموں میں کبھی کبھار ابھرنے والے اختلافات کو حل کرنے کا کوئی اور طریقہ ڈھونڈا جائے..........''۔

اس نے انقلابِ فرانس کا یوں دفاع کیا:

> ہر چیز ایک بحران کی طرف آ رہی تھی۔امکان تھا آزادی کا یا پھر غلامی کا۔ایک طرف تقریباً تیس ہزار فوج تھی، دوسری طرف عام نہتے شہری تھے، پیرس کے عام شہری جن پر قومی اسمبلی کا انحصار تھا......
>
> غیر ملکی فوجوں نے شہر کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ پرنس ڈی لامبسک، جو جرمن کیولری کے ایک دستے کی کمان کر رہا تھا، لوئی پانزدہ کے محل کے قریب پہنچا۔اس نے اپنی تلوار سے ایک بوڑھے آدمی کو پیٹا اور اُس کی توہین کی۔فرانسیسی لوگ بوڑھی عمر کے لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں..........۔ چنانچہ وہ بہت جوش سے متحد ہوئے، اور پورے شہر میں ایک لمحے کے اندر اندر ایک نعرہ پھیل گیا: ''ہتھیار اٹھالو، ہتھیار اٹھالو''۔ اُن کے پاس ہتھیار تھے نہیں، نہ ہی بہت سے ایسے لوگ تھے جنہیں ہتھیار استعمال کرنا آتا تھا۔مگر جب بھی امید داؤ پر ہو، ارادہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ جہاں پرنس ڈی لامبسک کا خاکہ بنا ہوا تھا وہاں نئے پل کی تعمیر کے لیے پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیر تھے، اور لوگوں نے اُن سے کیولری پر حملہ کر دیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر فرانسیسی گارڈوں کی ایک پارٹی اپنے کوارٹروں سے تیزی سے آئی اور عوام سے مل گئی اور رات پڑتے ہی کیولری پسپا ہو گئی۔
>
> پیرس کی گلیاں تنگ ہیں، دفاع کے لیے موزوں۔ اور گھروں کی بلندی، جن کی کئی منزلیں ہوتی ہیں، جہاں سے عظیم غصہ دلایا جا سکتا ہے، انہیں رات کے حملوں سے بچاتی تھی۔اس رات وہ ہر طرح کا اسلحہ جمع کرتے رہے۔ جو کچھ بھی ہاتھ لگ سکتا تھا، بندوقیں، تلواریں، لوہار کے ہتھوڑے، ترکھان کی کلہاڑیاں، لوہے کی میخیں،

دوشاخے، سلاخیں، ڈنڈے وغیرہ وغیرہ۔جس ناقابلِ بیان تعداد میں وہ اگلی صبح جمع ہوئے، اور اس سے بھی ناقابلِ بیاں جس عزم کا اظہار کر رہے تھے، اُس نے ان کے دشمنوں کو حیران کر دیا۔نئی وزارت کو ایک ایسے استقبال کی توقع بہت کم تھی۔انہیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ آزادی ایسے روحانی فیضان کے قابل تھی، یا یہ کہ نہتے شہریوں کا ایک گروہ تیس ہزار آدمیوں کی مسلح قوت کا سامنا کرنے کی جرأت کر سکے گا۔اِس دن کا ہر لمحہ اسلحہ جمع کرنے پر لگا دیا گیا، منصوبے بنانے میں اور خود کو ایسے بہترین نظم میں منظّم کرنے میں جس کی اس طرح کی فوری تحریک متحمل ہو سکتی تھی۔ بروگلیو، شہر کے گرد لیٹا رہا، مگر اِس روز کوئی مزید پیش قدمی نہ کی، اور اگلی رات ایک ایسی سکون سے گزر گئی جس کی اس طرح کا منظر ممکنہ طور پر اجازت دیتی ہے۔

مگر شہریوں کا مقصد دفاع نہ تھا۔ایک کاز داؤ پر تھا جس پر ان کی آزادی یا اُن کی غلامی کا انحصار تھا۔وہ ہر لمحہ ایک حملے کی توقع کر رہے تھے، یا نیشنل اسمبلی پر ایک حملہ کرنے کی خبر سننے کی توقع کر رہے تھے۔اور اس طرح کی صورت حال میں فوری ترین اقدامات کبھی کبھی بہترین ثابت ہوتے ہیں۔ جو چیز اب خود کو ظاہر کر رہی تھی وہ باسٹلی کا قلعہ تھا۔اور ایک ایسی فوج کے سامنے اس طرح کے ایک قلعے کو حاصل کرنے کا دھوم دھام نئی کابینہ کے اندر (جسے اجلاس کرنے کا موقع ابھی تک نہ ملا تھا) ایک دہشت پیدا کرنے میں ناکام نہیں ہوتا۔درمیان میں قبضہ کی گئی مراسلت سے یہ انکشاف ہوا کہ پیرس کا میئر ڈفل سیلز، جو کہ سٹیزنوں کے حق میں لگتا تھا، اصل میں اُن سے بے وفائی کر رہا ہے۔اس انکشاف سے اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ بروگلیو شام کو باسٹلی کو مزید کمک پہنچائے گا۔اس لیے اُس پر اُسی روز حملہ کرنا ضروری تھا؛ مگر اس سے قبل کہ ایسا کیا جاتا، یہ ضروری تھا کہ میسر ہتھیاروں کی بہ نسبت ہتھیاروں کی ایک بہتر سپلائی حاصل ہو۔

''وہاں، شہر سے ملحقہ ہسپتال میں اسلحہ کا ایک وسیع ذخیرہ پڑا تھا، جس کے انچارج کو

سٹیزنوں نے ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ اور چونکہ وہ جگہ نا قابلِ دفاع تھی، نہ ہی دفاع کی کوئی خاص کوشش کی گئی لہٰذا وہ جلد ہی کامیاب ہوگئے۔ اب مسلح ہو کر وہ باسٹلی قلعہ پر حملہ کرنے روانہ ہوگئے؛ تمام عمروں اور تمام درجوں کی ایک وسیع مخلوط مخلوق، ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس۔ اس طرح کے کسی جلوس کے ظاہر ہونے کے بیان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی واقعات کے لیے اس ہیجان کو جسے چند گھنٹے یا چند منٹ پیدا کریں۔ وزارت کیا منصوبے بنا رہی تھی شہر کے اندر لوگوں کو اس قدر نا معلوم تھا جتنا کہ جو کچھ سٹیزن کر رہے تھے، ان کے بارے میں وزارت بے خبر تھی۔ اور یہ بات بھی سٹیزنوں کو معلوم نہ تھی کہ بروگلیو اس جگہ کی کمک کے لیے کیا کرے گا۔ سب کچھ پُر اسرار تھا............''۔

''باسٹلی قلعہ پر بہادری اور جوش کے ساتھ حملہ کیا گیا، اس طرح کا حملہ جسے صرف آزادی کی بلند ترین جان آفرینی ہی ابھار سکتی ہے۔ یہ حملہ چند گھنٹوں تک جاری رہا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے دنیا جس کی مکمل طور پر گرفت میں رہی۔ میں حملہ کی تفصیل بیان نہیں کر رہا ہوں، لیکن قوم کے خلاف سازش کا منظر لا رہا ہوں جس نے اُسے اشتعال دلایا، اور جو باسٹلی کے ساتھ ہی ٹوٹ گئی۔ وہ قید خانہ جس میں نئی وزارت نیشنل اسمبلی کو برباد کر رہی تھی، اس کے اور استبداد کے قلعہ ہونے کے علاوہ، باسٹلی اصل جگہ بنی جہاں سے شروعات کی گئیں۔ اس معرکے نے نئی وزارت کو توڑ دیا، جو کہ اب اُس کھنڈر سے بھاگنا شروع ہوئی جو انہوں نے دوسروں کے لیے تیار کیا تھا۔ بروگلیو کی فوجیں منتشر ہوگئیں، اور وہ خود بھی بھاگ گیا......

''یہ قومی اسمبلی اور پیرس شہر کا وقار ہے کہ ہر طرح کی اتھارٹی کے کنٹرول سے ماورا، اسلحہ اور کنفیوژن کے اس طرح کے ایک زبردست منظر نامے میں، وہ مثال اور پند و وعظ کے اثر سے اس قابل ہوئے کہ اس قدر تحمل کر سکیں۔ بنی نوعِ انسان کو ہدایت دینے اور روشن خیال کرنے میں، اور انہیں یہ دیکھنے کے قابل بنانے میں کہ ان

کا مفاد اُن کے نیک ہونے میں ہے نہ کہ اُن کے انتقام میں۔ اس قدر تکالیف کبھی نہ ہوئیں جتنی کہ انقلابِ فرانس میں ہوئیں''۔

اس کتابچہ میں ٹام نے سب انسانوں کے مشترکہ حقوق کی وکالت کی۔ ''تخلیق کی ہر تاریخ ایک نکتہ پر متفق ہے: انسان کی وحدت۔ یعنی سارے انسان برابری میں پیدا ہوتے ہیں، برابری کے فطری حقوق کے ساتھ۔ دنیا میں پیدا ہونے والے ہر بچے کے لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنا وجود خدا سے لاتا ہے۔ دنیا اس کے لیے اُسی طرح نئی ہے جس طرح اولین انسان کے لیے تھی اور اس کا فطری حق اُسی طرح کا ہے۔

''اور خدا نے کہا، میں خود اپنی شباہت میں انسان کو بناتا ہوں۔ خدا کی شباہت میں اُس نے اُسے تخلیق کیا، اُس نے انہیں مرد اور عورت تخلیق کیا''۔

فطری حقوق کے علاوہ شہری حقوق بھی ہوتے ہیں۔ انسان، سماج میں پہلے سے زیادہ بدتر ہونے کے لیے داخل نہیں ہوا، نہ ہی اس لیے کہ پہلے سے حاصل حقوق سے بھی کم حقوق رکھے۔ بلکہ وہ اس لیے دنیا میں داخل ہوا کہ اُن حقوق کی زیادہ ضمانت میسر ہو۔ اُس کے فطری حقوق اُس کے سارے شہری حقوق کی بنیاد ہیں۔

''فطری حقوق وہ ہیں جو انسان کے وجود کے حق کو یقینی بناتے ہیں۔ اس قسم میں سارے دانش ورانہ حقوق یا دماغ کے حقوق شامل ہیں، مذہب، اور نیز خود بطور فرد اپنے آرام اور مسرت کے بطور عمل کرنے کی آزادی کے حقوق جو دوسروں کے فطری حقوق کے لیے خطرہ نہ ہوں۔

''شہری حقوق وہ ہیں جو انسان کو سماج کا ایک ممبر ہونے کا بتاتے ہیں۔ وہ سارے حقوق جو حفاظت اور سلامتی سے متعلق ہوں''۔

''ہر شہری حق، ایک فطری حق سے اُگتا ہے''۔

فرانس کی قومی اسمبلی کی جانب سے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل اعلان نامہ منظور کیا گیا:

انسان اور شہریوں کے حقوق کا اعلان نامہ

1- انسان آزاد پیدا ہوا اور آزاد ہی رہے گا، اور اپنے حقوق کے حوالے سے مساوی۔لہٰذا شہری امتیازات صرف پبلک افادیت پر مبنی ہو سکتے ہیں۔

2- تمام سیاسی ایسوسی ایشنوں کا خاتمہ انسان کے فطری حقوق کی نگہداشت ہے۔اور یہ حقوق ہیں؛ آزادی، ملکیت، تحفظ اور ظلم کی مزاحمت۔

3- قوم ہر طرح کی سالمیت کا سرچشمہ ہے، نہ کہ کوئی فرد یا افراد کا کوئی گروپ۔

4- سیاسی آزادی میں وہ سب کچھ کرنے کی آزادی شامل ہے جو دوسرے کو تکلیف نہ دیتا ہو۔ ہر شخص کی فطری آزادیوں کے استعمال کی کوئی اور سرحدیں نہیں ہیں، ماسوائے ان کے جو دوسرے ہر انسان کے انھی حقوق کے آزادانہ استعمال کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔اور یہ سرحدیں صرف قانون سے متعلق ہوتی ہیں۔

5- قانون صرف انہی اقدامات سے منع کرے گا جو سماج کے لیے نقصان دِہ ہوں۔ جو کچھ قانون کی رو سے منع نہیں ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔نہ ہی کسی کو کسی ایسی بات پہ مجبور کیا جائے گا جو قانون نہ چاہتا ہو۔

6- قانون کمیونٹی کی خواہش کا ایک اظہار ہے۔سارے شہریوں کو اس کے بنانے میں متفق ہونے کا حق ہے، شخصی طور پر بھی، یا پھر اُن کے نمائندے کی طرف سے۔ قانون سب کے لیے یکساں ہے۔خواہ یہ بچائے یا سزا دے۔اور سب اس کی نظر میں برابر ہوں گے۔سارے لوگ اعزازات، عہدوں اور روزگاروں میں اپنی اپنی مختلف صلاحیتوں کے مطابق مساوی طور پر مستحق ہوں گے۔کوئی اور امتیاز نہ ہوگا، ماسوائے اِس کے جو کچھ ان کی نیکیوں اور صلاحیتوں نے پیدا کیے۔

7- قانون میں متعین کردہ معاملات کے ماسوا اور اس کی بیان کردہ صورتوں کی مطابقت کے ماسوا کسی شخص کو الزام نہیں دیا جا سکتا، گرفتار نہیں کیا جا سکتا، اور نظر بند نہیں

کیا جا سکتا۔ وہ سب لوگ جو من مانی احکامات دیں، یا انہیں فروغ دیں، ان کی درخواست کریں، یا انہیں بجا لائیں، وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔اور قانون کے مطابق بلایا گیا یا گرفتار کردہ ہر شہری کا پیش ہونا ضروری ہوگا۔ ہر شہری فوراً تعمیل کرے گا، اور مزاحمت سے گریز کرے گا۔

8- قانون کوئی جرمانے نہیں لگائے گا ماسوائے اُن کے جو مطلق اور بلا شک وشبہ ضروری ہوں۔اور کسی کو سزا نہ ہوگی ماسوائے قانون کی مطابقت کے، جو جرم سے قبل اعلان شدہ تھا، اور قانونی طور پر اطلاق شدہ تھا۔

9- ہر شخص معصوم تصور ہوگا جب تک کہ عدالت میں مجرم ثابت نہ ہو۔جب بھی اس کی گرفتاری ناگزیر ہو، تو اس کی ذات کی حفاظت کے لیے ضروری سے زیادہ اس پر ساری سختیاں، قانون کے خلاف ہوں گی۔

10- کوئی شخص اپنی رائے کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا، نہ ہی اپنے مذہبی رایوں پہ۔ بشرطیکہ اس کے اقدام قانون کے مہیا کردہ عوامی نظم و نسق کو ڈسٹرب نہ کریں۔

11- خیالات اور رایوں کا بلا رکاوٹ ابلاغ انسان کے قیمتی ترین حقوق میں سے ایک ہے۔ ہر شہری آزادانہ بول سکتا ہے، لکھ سکتا ہے اور چھپ سکتا ہے۔ وہ قانون میں متعین کردہ اس حق کو غلط استعمال کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

12- انسانوں اور شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے ایک عوامی فورس ضروری ہے۔وہ فورس کمیونٹی کے مفاد کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ اُن اشخاص کے مفاد کے لیے جن کے یہ سپرد ہے۔

13- عوامی فورس کی مدد کے لیے، اور حکومت کے دیگر اخراجات کے لیے ایک مشترک چندہ لازم ہے۔ یہ کمیونٹی کے سارے ممبروں میں اُن کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔

14- ہر شخص کو ذاتی طور پر یا اپنے نمائندے کے ذریعے، عوامی چندوں کی ضرورت،

اُن کا تصرف اوران کی مقدار، خرچ کے طریقوں، اور دورانیہ کے بارے میں، تعین کرنے میں آزادانہ رائے دینے کا حق ہوگا۔

15- ہرکمیونٹی کواپنے سارے نمائندوں، اوران کے برتاؤ سے متعلق باز پرس کا اختیار ہوگا۔

16- ہرکمیونٹی، جس میں اختیارات کی علیحدگی اورحقوق کی ضمانت مہیا نہیں ہے، ایک آئین چاہتی ہے۔

17- جائیداد کا حق مقدس اور نا قابلِ دست درازی ہے، کوئی اس سے محروم نہ ہوگا، ماسوائے قانونی طور پر تعین کردہ عوامی ضرورت کے معاملات کے۔

****

اپنے پمفلٹ میں ٹام پین کہتا ہے کہ؛

''عقل خود اپنی تابعداری کرتی ہے اور جہالت ہراُس شے کی تابعداری کرتی ہے، جس کی تابعداری کا اُسے کہا جائے۔

دنیا میں دوقسم کی حکومتیں رائج ہیں۔ پہلی وہ جو منتخب ہوئی ہے۔ دوسری موروثی طور پر منتقل ہونے والی۔ پہلی والی قسم کو ریپبلک کہتے ہیں، دوسری کو بادشاہت اورارسٹوکریسی۔

یہ دونوں ممتاز اور مخالف صورتیں خود کو عقل وجہل کی دو ممتاز اور مخالف بنیادوں پر کھڑی کرتی ہیں، اس لیے کہ حکومت چلانے میں صلاحیتوں اور قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کی موروثی منتقلی نہیں ہوتی، اس لیے ظاہر ہے کہ موروثی اقتدار کو ایک عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے انسان کی دلیل نہیں مانتی، اور جو کہ صرف جہل پہ قائم ہوسکتی ہے۔ اور کوئی ملک جتنا زیادہ جاہل ہوگا، اتنا ہی وہ اس طرح کی حکومت کے لیے موزوں ہوگا۔

اس کے برعکس ایک اچھی طرح بنی ہوئی ریپبلک میں حکومت کو کسی بھی ایسے عقیدے کی

ضرورت نہیں ہوتی جو کہ اس کی دلیل سے اُس پار ہو۔ وہ سارے نظام کو، اُس کی ابتدا اوراُس کے استعمال کو استدلال سے دیکھتا ہے۔ اور چونکہ اسے بہترین حمایت حاصل ہوتی ہے جب اس کی بہترین تفہیم ہوتی ہے، اس لیے انسانی صلاحیتیں بے باکی سے عمل کرتی ہیں، اوراس حکومت کے تحت ایک عظیم الجثہ جواں مردی حاصل کرتی ہیں۔

لہٰذا، چونکہ دونوں میں سے ہرصورت ایک مختلف بنیاد پر کام کرتی ہے۔ ایک دلیل کی مدد سے آزادانہ چلتی جاتی ہے، دوسری جہل کی مدد سے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس حکومت کو کیا چلاتی ہے جسے مکس (Mix) حکومت کہتے ہیں۔ یا جسے کوئی اورنام دیا جاتا ہے۔ اس حکومت کی قوتِ متحرکہ کرپشن ہوتی ہے۔ ایسی حکومت میں کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ پرزے ایک دوسرے پراُس وقت تک پردہ ڈالتے ہیں جب تک کہ ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، اور کرپشن جو کہ مشین کو چلاتی ہے، بہ یک وقت خود اپنے فرار کی سازش کرتی ہے۔ جب ایک محاورے کے طور پر یہ بولا جاتا ہے کہ ' بادشاہ غلطی نہیں کرسکتا ' تو یہ اُسے اسی طرح کے ایک تحفظ پہ متعین کرتا ہے جو کہ احمقوں اور پاگلوں کا ہوتا ہے، اوراُس کے اوپر ذمہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ پھر نیچے وزیر کو منتقل ہوتی ہے جو کہ خود کو پارلیمنٹ میں ایک اکثریت کی چھتری تلے ڈالتا ہے، جسے وہ عہدوں، پنشنوں اور کرپشن کے ذریعے ہمیشہ کمان کرتا ہے۔ اوروہ اکثریت، خود کو اُسی اتھارٹی سے جواز دیتی ہے جس کے ساتھ وہ وزیر کو تحفظ دیتی ہے۔ اس چکری حرکت میں ذمہ داری پرزوں سے پھینکی جاتی ہے، اور مجموعے سے بھی۔

جب کسی حکومت میں ایک عضو کوئی غلطی نہیں کرسکتا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ کام نہیں کرتا، اور وہ محض ایک اور قوت کی مشین ہے، جس کی ہدایت وحکم پر وہ عمل کرتا ہے۔ کابینہ ہمیشہ پارلیمنٹ کا حصہ ہوتی ہے، اور ممبر ایک ہی چارٹر میں اس چیز کو جواز دیتے ہیں۔

ان اشاروں سازشوں کے ذریعے، اور منظر اور کردار کی تبدیلی کے ذریعے، اعضا

معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، جنہیں ان میں سے کوئی بھی تنہا نہیں سنبھالتا۔ جب پیسہ حاصل کرنا ہو، تو تنوع کا انبار پگھل جاتا ہے، اور اعضا کے بیچ پارلیمانی تعریفوں کی ایک بھرمار ہوتی ہے ۔ ہر ایک حیرت کے ساتھ دوسرے کی بصیرت، فراخدلی اور بے لوثی کی تعریفیں کرتا ہے، اور وہ سب 'قوم' کے مصائب پر ترس کی ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہیں۔

مگر ایک اچھی طرح بنی ریپبلک میں اس طرح کی کوئی سپاہ گری، تعریفیں اور ترسیں نہیں ہوسکتیں۔ یہاں نمائندگی ملک بھر سے مساوی ہوتی ہے اور خود میں مکمل ہوتی ہے۔ گوکہ یہ آئین سازی اور انتظامیہ میں مرتب ہوتی ہے، اُن سب کی وہی ایک ہی فطری سرچشمہ ہوتی ہے۔ اعضا ایک دوسرے سے مکمل نہیں ہوتے، جیسا کہ جمہوریت، ارسٹو کریسی، اور بادشاہت ۔ کیونکہ کوئی مخالفانہ امتیازات نہیں ہوتے، تو مصالحت سے کرپٹ کرنے کی کوئی چیز نہیں ہوتی، نہ ہی سازشوں سے آلودہ۔

جب انسانوں کو بادشاہ اور رعایا کے بطور پکارا جائے گا، یا جب حکومت کی بادشاہت، ارسٹوکریسی اور جمہوریت کے الگ الگ یا مشترکہ ماتحتی کا تذکرہ ہوتا ہے، تو دلیل دینے والا آدمی ان اصطلاحات سے کیا سمجھے گا؟ اگر انسانی اقتدار کے دو یا زیادہ مخصوص اور الگ عناصر موجود ہوتے، تو پھر ہم کئی ابتدائیں دیکھتے جن پر وہ اصطلاحات لاگو ہوتیں۔ مگر چونکہ انسانوں کی ایک ہی قسم ہے تو انسانوں کے اقتدار کا ایک ہی عنصر ہوتا ہے ۔ اور وہ عنصر خود انسان ہے ۔ بادشاہت، ارسٹوکریسی، اور جمہوریت بس تصور کی تخلیق ہیں۔.........''

ٹام پین نے یورپ میں موجود بادشاہوں، بادشاہی نظام اور بادشاہی سماجی اداروں پہ زبردست تنقید کی؛ ''یہ وقت ہے کہ قومیں ذی شعور و معقول ہوں اور انہیں جانور سمجھ کر ان پہ سواری کی مسرت کے لیے حکمرانی نہ کی جائے''۔

......اور یہ سلسلہ مزید پورے سو صفحے تک چلتا ہے۔

جب یہ کتابچہ چھپ گیا تو ایک سنسنی پیدا ہوگئی۔ صرف اُسی ایک سال میں اس کے آٹھ ایڈیشن چھپے۔ امریکہ میں بھی یہ کتاب چھاپ دی گئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکتی چلی گئی۔ برطانوی حاکم طبقے کے لیے تو یہ ایک عذاب تھا۔ مگر برطانوی عوام نے اس کے اعزاز میں ایک خوبصورت گیت کمپوز کیا گیا:

وہ آرہا ہے .... عظیم مصلح آرہا ہے
اپنا ڈھول بجانا بند کردو، بند کردو اپنے ڈھول............
پُرمسرت لہریں چاروں طرف پھیلتی ہیں
بادشاہ آواز سے کانپ جاتے ہیں
آزادی آزادی آزادی آزادی
انسان کے حقوق، پین دوبارہ بولتا ہے

برکے نے اس کتابچے کا جواب لکھا تو پین نے **انسان کے حقوق**، حصہ دوم لکھ ڈالا۔ اس میں اُس نے لکھا کہ مطلق العنان حکمرانی، غربت، ناخواندگی، بے روزگاری اور جنگیں یورپ کی بربادی کی وجوہات تھیں۔ ایک ایک کر کے اس نے انہیں مذمت کا نشانہ بنایا۔ اس نے بادشاہت کی بھرپور مخالفت کی اور ریپبلک کے قیام پہ دلائل کے انبار لگا دیے۔ اس نے حکمران طبقات کے خلاف خونی انقلاب کی زبردست وکالت کی۔

تھامس پین فرانس میں بادشاہت بیان کرتے ہوئے دراصل ساری دنیا میں بادشاہی نظام کے بارے میں بتاتا ہے۔

پین، بھکشوؤں کی حکمرانی کی بھی سخت مخالفت کرتا ہے جو اپنے مندر کی چار دیواری سے باہر کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ پنڈتی نظام کو بادشاہت والے نظام جیسا قرار دیتا ہے۔ پین کے ہاں تو انسان آزاد پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے اور حقوق میں مساوی پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ ساری آبادی حاکمیت اعلیٰ کی حامل ہے نہ کہ ایک فردِ واحد یا چند افراد کا گروہ۔ بادشاہت انسانیت کا دشمن اور دکھوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

پین نے ایک فکری مغالطے کو بہت خوبصورتی سے مسترد کیا۔ ایسا فکری مغالطہ جو پاکستان میں بھی ملاؤں اور ٹی وی دانش وروں نے پھیلا رکھا ہے۔ وہ فکری مغالطہ ہے: 'فرد میں اصلاح ہوگی تو معاشرہ خود بخود سُدھر جائے گا'۔ ٹام پین نے اِس گمراہ کن نعرے کو مسترد کر دیا۔ اُس نے ایک اچھے سماج کے قیام کے لیے فرد میں نہیں، نظام میں اصلاح کرنے کو بنیادی شرط قرار دیا۔

وہ دلیل پہ دلیل، سوال پہ سوال کرتا جاتا ہے اور اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا جاتا ہے:

''......کیا انسان اپنی محنت سے خود مستفید ہوں گے یا اُن کی محنت حکومتوں کی عیاشی پر صرف ہوگی؟۔ آیا عدالتوں سے ڈاکہ زنی، اور دیہاتوں سے تباہ حالی ختم ہوگی؟۔ جب ہم مہذب کہلانے والے ملکوں میں کمسنوں کو کام کی جگہوں میں جاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور نوجوانوں کو پھانسی کے پھندے پر، تو نظامِ حکومت میں کچھ تو غلط ہوگا۔ ہوسکتا ہے باہر سے ایسا لگے کہ ایسے ممالک میں خوشی ہی خوشی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں بڑے پیمانے میں موجود تباہ حالی چھپی ہوتی ہے ....سول حکومتیں پھانسیوں کی سزاؤں پر قائم نہیں رہتیں۔ نوجوانوں کی ہدایت کے لیے لازم ہے کہ غذائی اشیا کی فراہمی ہوتا کہ جس قدر ممکن ہو ایک سے عیاشی باہر نکل جائے اور دوسرے سے مایوسی۔ مگر اس کے بجائے ممالک کے وسائل بادشاہوں، درباروں، فریب کاروں، ضمیر فروشوں اور رنڈیوں پر لٹائے جاتے ہیں.....غریب کسی اخلاقیات کے بغیر پلتے ہیں، اور ایک امکان کے بغیر دنیا میں پھینکے جاتے ہیں۔ اس لیے وہی بری عادتوں اور قانونی بربریت کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ لاکھوں کروڑوں روپے جو حکومتوں پر غیر ضروری طور پر ضائع کیے جاتے ہیں، اِن برائیوں کی اصلاح کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں اور ہر فرد کی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔''

ٹام نے ایک جگہ لکھا کہ، ''یہ میرے فائدے میں رہا کہ میں نے زندگی کو ایک سیکھنے والے کے بطور گزارا ہے۔ میں اخلاقی ہدایات کی قدر و قیمت جانتا ہوں اور میں نے اس کے برعکس والے حضرات دیکھے ہیں...... اوائل عمر میں اپنے خلاف ساری مشکلات کے ہوتے ہوئے، میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں، کہ پرعزمی، ثابت قدمی، اور بے غرضی کے ساتھ مصائب کا سامنا کرتے ہوئے میں نے دنیا میں نہ صرف ایک نئی سلطنت کھڑی کرنے میں اپنا حصہ ڈالا، حکومت کا ایک نیا نظام قائم

کیا بلکہ میں سیاسی لٹریچر میں ایک امتیازی حیثیت پر پہنچا ہوں، جس پہ کامیابی اور سبقت کرنا ہر لحاظ سے مشکل ترین ہوتا ہے، جس پر کہ ارسٹوکریسی اپنی ساری مدد و حمایت کے باوجود نہ پہنچ سکی۔ خود اپنے دل کو جانتے ہوئے، اور خود کو محسوس کرتے ہوئے کہ، پارٹی کی ساری کشمکشوں، مفاد یا پھر غلط کردہ مخالفوں سے بالا ہو کر میں باطل یا گالی کا جواب نہیں دیتا بلکہ برطانوی حکومت کی خامیوں کی نشاندہی کرتا چلا جاتا ہوں..........''۔

''یہ کہنا اصطلاحات کی ایک گمراہی ہے کہ چارٹر (منشور) حقوق دیتا ہے۔ اصل میں یہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ چارٹر حقوق دیتا نہیں، لیتا ہے۔ حقوق تو سارے باشندوں میں موروثی ہوتے ہیں مگر چارٹرز، ان حقوق کو منسوخ کرتے ہوئے، اکثریت کو باہر نکال کر، حقوق چند کے ہاتھوں میں دیتے ہیں.......... لہٰذا سارے چارٹرز ایک بالواسطہ منفی کاروائی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے ۔ حقوق تو عالمی اور عالم گیر ہوتے ہیں۔ جہاں جایئے وہ حقوق آٹو میٹک طور پر آپ کو ملنے چاہئیں ۔ حقوق ملکی سرحدوں یا ایک خاص قوم سے تعلق رکھنے تک محدود نہ ہوں۔ حقوق جائیداد کے ہونے یا نہ ہونے میں فرق نہ رکھیں''۔

''رواداری، عدم رواداری کی متضاد نہیں ہے، بلکہ اس کی نقل ہے۔ دونوں جبر ہیں۔ ایک 'ضمیر کی آزادی' سے باز رکھنے کے حق کو خود تک فرض کرتی ہے، اور دوسری اُسے عطا کرنے کے حق کو۔ ایک آگ اور ایندھن سے مسلح پوپ ہے اور دوسری معافیاں بیچنے یا عطا کرنے والا پوپ ہے۔ اول الذکر چرچ اور ریاست ہے اور دوسری چرچ اور ٹریفک ہے۔

''مگر برداشت و رواداری کو ایک قوی تر روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انسان خود کی پرستش نہیں کرتا بلکہ اپنے بنانے والے کی پرستش کرتا ہے؛ اور جس ضمیر کی آزادی کا وہ دعویٰ کرتا ہے وہ اس کی ذات کی عبادت کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اپنے خدا کی عبادت کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں، ہمارے پاس دو وجودوں کا مشترکہ تصور ہونا چاہیے: 'فانی' جو عبادت کرتا ہے، اور 'غیر فانی ہستی' جس کی عبادت کی جا رہی ہے۔ لہٰذا رواداری خود کو انسان اور انسان کے درمیان نہیں رکھتی، نہ ہی چرچ اور چرچ کے درمیان، نہ ہی ایک یا دوسرے مذہب کی بالادستی کے درمیان، بلکہ خدا اور انسان

کے درمیان۔

''اگر کسی پارلیمنٹ میں اس عنوان سے ایک بل پیش کیا جائے 'پرآتما کو ایک یہودی یا ایک ترک کی عبادت وصول کرنے' کو برداشت کرنے یا آزادی عطا کرنے' کا بل۔ یا 'پرآتما کو اس عبادت کو وصول کرنے سے منع کرنے کا بل' تو سارے انسان چونک جائیں گے اور کفر کہیں گے۔ ایک شوروغوغا برپا ہوگا۔ پھر دھرمی معاملات میں برداشت ورواداری کا گمان خود کو بے نقاب انداز میں پیش کرے گا۔ مگر یہ گمان کم نہیں ہے اس لیے کہ 'انسان' کا نام اُن قوانین پر نمودار ہوگا، اس لیے کہ 'معبود' اور 'عابد' کے مشترک تصور کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر کون ہو تم، بے حقیقت گرد اور راکھ! تم جس بھی نام سے پکارے جاؤ، خواہ بادشاہ، بشپ، چرچ یا ریاست، پارلیمنٹ، یا کوئی اور چیز جو انسان کی روح اور اس کے بنانے والے کے درمیان اپنی ناچیزیت کو خواہ مخواہ مخل کرتی ہے؟''۔

ٹام پین انسان کی آزادی کے لیے صرف اتنا ضروری سمجھتا ہے کہ انسان آزاد رہنے کا بس ارادہ کرلے۔ وہ حکومتوں کے لیے بھی بس ایک ہی چیز لازمی قرار دیتا ہے: ''حکومت کا ایک ہی مقصد ہونا چاہیے: عمومی خوشی''۔

ٹام پین نے عوام کے دفاع میں دلائل کا ڈھیر لگا دیا.......... ''جب لوگ محکومیتوں کے احساس سے زخمی زخمی ہوں، اور نئے حوالوں کے امکانات سے ڈرے ہوئے ہوں تو فلسفہ کی پرسکونی یا بے حسی کے فالج کی تلاش کی جانی چاہیے''۔

واضح رہے کہ باستیلی والے اس ابھار میں شہری، جدوجہد کے دوران اپنے مخالفوں سے زیادہ تعداد میں گرے۔ مگر چار سے پانچ افراد لوگوں کے گھیرے میں آئے اور فوری طور پر مار دیے گئے۔ باسٹلی کے گورنر اور پیرس کے میئر کی غداری کا پتہ چل گیا تھا اور بعد میں نئی وزارت میں سے ایک فاؤلون اور اس کے داماد برتھیئر کی غداری بھی معلوم ہوگئی تھی، ان کے سر نیزوں پہ لگا کر پورے شہر میں گھما دیے گئے۔ سزا کے اسی طریقے سے برکے اپنا صدماتی منظر کشی تعمیر کرتا ہے۔

ٹام لوگوں کے اس رویے تک پہنچنے کی یوں توضیح کرتا ہے: ''لوگ ایسی باتیں حکومتوں سے

سیکھتے ہیں جن کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں، اور اسی انداز میں سزاؤں کا جواب دیتے ہیں جنہیں وہ سہنے کے عادی بنا دیے گئے۔ برسوں تک پیرس میں نیزوں پر سر، موجود رہے۔ پھر یہی کچھ برطانوی حکومت نے کیا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سزا ایک ایسے انسان پر خاص فرق نہیں ڈالے گی اگر مرنے کے بعد اسے دی جائے؛ مگر یہ زندوں پر بہت اثر رکھتی ہے۔ یہ سزا یا تو ان کے احساسات کو زخمی کرے گی یا اُن کے دل سخت تر بنا دے گی۔ اور دونوں صورتوں میں یہ انہیں بتائے گی کہ جب ان کے پاس طاقت آئے گی تو انہیں کس طرح سزا دینی ہے۔ اس لیے سیدھا کام کرو اور حکومتوں کو انسانیت پڑھاؤ۔ یہ انہی کی سفاک سزائیں ہیں جو بنی نوع انسان کو کرپٹ بناتی ہیں۔

''القابات تو بس عرفی نام ہوتے ہیں، اور ہر عرفی نام ایک اعزاز ہوتا ہے۔ یہ چیز بذاتِ خود مکمل طور پر غیر ضرر رساں ہوتی ہے، مگر یہ انسانی کیریکٹر میں ایک طرح کی حماقت کو ظاہر کرتی ہے جو اسے کم رتبہ کرتی ہے۔ یہ انسان کو چھوٹا بناتی ہے، ایسی چیزوں میں جو عظیم ہیں، اور عورتوں کی نقل، ایسی چیزوں میں جو چھوٹی ہیں......''

اسی دوران فرانس میں 20 اور 21 جون 1791 میں بادشاہ نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر وہ پکڑا گیا اور اسے واپس پیرس لایا گیا۔ اگلی برائی یہ آئی کہ 1792 میں فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مگر اس جنگ میں پروشیا آسٹریا کا ساتھی بنا اور یہ دونوں یعنی آسٹرو-پروشیائی فوج تیزی سے فرانس میں داخل ہوگئی اور پیرس کی طرف بڑھنے لگی۔

پیرس کے انقلابی دس اگست 1792 کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ٹیولریز محل پر قبضہ کر لیا جہاں لوئی شانزدہم نامی بادشاہ رہائش پذیر تھا۔ شاہی خاندان کو گرفتار کیا۔ پیرسی عوام جیل خانوں میں گھس گئے اور اشرافیہ اور ملّاؤں کا قتل عام کیا۔ نیشنل ازم سے مخمور عوام نے 20 ستمبر کو پروشیائیوں کی پیش قدمی روک دی۔ اگلے دن اسمبلی نے بادشاہت کا خاتمہ کر کے ریپبلک کا اعلان کیا۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فرانس میں انقلابیوں کے ان اقدامات سے دنیا بھر میں امیروں، فیوڈلوں، ملاؤں اور پیروں میں کس قدر خوف پھیلا ہوگا۔ سب اپنے اپنے ہاں فرانس جیسے واقعات

کی روک تھام میں لگ گئے۔

انگلینڈ کے حکمران طبقات نے بھی یہی کیا۔انسان کے حقوق والا کتابچہ برطانوی حکمرانوں کو ہضم نہ ہوا۔ چنانچہ انگلینڈ میں پین کی کتاب پر پابندی لگ گئی۔ پبلشر کو غداری کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ کتب فروش پُر اسرار طور پر مرنے لگے۔ پین کو غدار قرار دیا گیا اور اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ سرکاری ایجنٹ اس کے پیچھے پڑ گئے، مشتعل جلوس منظم ہوئے، نفرت بھرے جلسے ہوئے، اس کے پتلے جلائے جانے لگے۔

اِدھر، 55 سالہ پین کو پھانسی سے بچنے کی خاطر لندن سے بھاگنا ہی تھا۔مگر کہاں؟ امریکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔............تب فرانس میں انقلاب نے تھامس پین کو اپنی جانب کھینچ لیا۔اُسے فرانس آنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ایک رات صبح کاذب کو موت کو جُل دے کر، بہت ہی انقلابی گیری میں ہمارا اٹھارویں صدی کا یہ چے گویرا (ٹام پین) انگلینڈ سے فرار ہو گیا اور تیسرے ملک یعنی فرانس داخل ہوا (سال 1792 میں)۔ جہاں انقلاب کے شعلے فیصلہ کن اقدام کر چکے تھے۔

دلچسپ ہے کہ ٹام پین انگلینڈ کا ''کامن سینس'' تو لکھ چکا تھا۔مگر یہاں انقلاب نہیں آنا تھا، اس لیے کہ یہ امریکہ نہ تھا۔ پیچھے انگلینڈ میں اس پر غیر حاضری میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے توہین آمیز تحریر کا مجرم قرار دیا گیا۔

اِس 'گناہ گاری'' کا پین نے یہ جواب دیا: 'اگر فراڈ اور بادشاہت کے نفاذ کو بے نقاب کرنا، عالمی امن، تہذیب اور تجارت کو فروغ دینا، سیاسی پُراسراریت کی زنجیروں کو توڑ دینا، اور تذلیل کردہ انسان کو اٹھا کر اسے اُس کے مناسب مقام پر لا کھڑا کر دینا توہین آمیز ہیں......تو توہین آمیز مواد شائع کرنے کے مجرم والے الفاظ میری قبر پر کندہ ہونے دو۔''

پین فرانس میں......ریپبلکن فرانس میں

فرانس نے انگلینڈ میں پھانسی سے بھاگ کر آنے والے پین کا زبردست استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں فوجی انقلابی مارچ پاسٹ ہوا، اس کی تکریم میں ٹوپیاں اتاری گئیں۔ اور ننگے سر اس کے احترام میں جھک گئے۔ اسے وہاں کی اعزازی شہریت دی گئی۔ فرانس والوں نے ایک نہیں، دو نہیں، چار حلقوں سے اس غیر ملکی کو اپنی قومی اسمبلی کا ممبر بنایا۔ اسمبلی نے جن غیر ملکی اچھے لوگوں کو فرانسیسی شہریت دینے کی منظوری دی اُن میں پین، پریسٹلے، بینتھم، واشنگٹن، ہملٹن، میڈی سن، کلوپسٹاک، کلوٹس اور دیگر بین الاقوامی شہرت یافتہ ریپبلکی شامل تھے (1)۔ یہ وہی قومی اسمبلی تھی جس نے بادشاہت ختم کر دی تھی، اور فرانس کو ایک ریپبلک قرار دیا تھا۔ ریپبلک کے لیے اردو میں 'جمہوریہ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایسا ملک جہاں بادشاہت کی بجائے ووٹ والی پارلیمنٹ، آزاد عدلیہ اور وسیع شہری آزادیاں ہوں۔ ٹام پین نہ صرف اس ریپبلک کا شہری تھا، نہ صرف اس کی پارلیمنٹ کا ممبر تھا بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر اس کی عزت یہ ہوئی کہ اسے فرانس کا آئین لکھنے کو کہا گیا۔ وہ تقریباً پوری دہائی فرانس میں رہا اور انقلابِ فرانس کے ساتھ قریبی طور پر جڑا رہا۔

وہاں نیشنل کنونشن (قومی اسمبلی) میں دو پارٹیاں تھیں۔ جو اندر سے بہت سخت دشمنی میں تھیں۔ ایک پارٹی جو اقتدار میں حاوی طور پر موجود تھی وہ تھی؛ گیرونڈن پارٹی۔ اس کی قیادت کو

نڈورسیٹ اور مادام رولاں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ فرانس میں ایک بوژوار پبلک قائم کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ دوسری اور مخالف پارٹی کا نام تھا؛ جیکو بن پارٹی۔ اُس کی سربراہی سخت گیر شخص رابس پائیرے کر رہا تھا۔ یہ لوگ نچلے طبقات کو سیاسی معاشی اقتدار میں زیادہ حصہ دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بورژوا معیشت کے خلاف، اور اُسے ختم کرنے کے لیے بغاوت نہیں کی تھی بلکہ وہ جائیداد کی ماری دنیا کو شہریوں کی سیاسی زندگی کے تابع کرنے کے لیے لڑے تھے۔ اِن جیکو بن والوں کو مارکس نے 'انقلابِ فرانس کے دن میں خواب دیکھنے والے دہشت گرد' کہا تھا۔

ٹام پین کا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کے سارے جاننے والے اور دوست گیرونڈن پارٹی میں تھے۔ وہ اُن سے قریبی طور پر جڑا ہوا تھا۔ لہٰذا وہ فطری طور پر گیرونڈن پارٹی کے قریب تھا۔ اسی لیے مونٹین والے جیکو بن اور بالخصوص رابس پائیرے اُسے دشمن گردانتا تھا۔

ٹام پین نے آئین ساز کمیٹی میں کام کیا اور فرانس کا آئین لکھنے میں سرگرم حصہ لیا۔ اُس نے فرانس کو ریپبلک بنانے کے حق میں ووٹ دیا۔

مگر رکیے ساتھی!۔ ہم ٹام پین کی بات کر رہے ہیں، کسی ایرے غیرے کی نہیں۔ وہ تشدد کے قوانین کو انقلاب کے عمومی قوانین پہ بھاری ہونے نہیں دیتا تھا۔ قتلِ عام پہ مبنی تبدیلی، انقلاب نہیں ہوتی۔ اُس نے تشدد کی زبردست مخالفت کی.......... مگر یہاں پین کے آزمائے ہوئے امریکی عوام نہ تھے۔ یہاں پر تو وہ عوام تھے جن پر نسلوں سے نفرت، خوف، اور استبداد کی حکمرانی رہی تھی۔ چنانچہ تماشا ہو گیا۔ انقلابیوں نے اسمبلی کے اندر معزول بادشاہ، لوئی شانزدہ سے انتقام لینے کی صدائیں لگائیں۔ اس کو گلوٹین کرنے (سزائے موت دینے) کی زوردار تجویز آئی۔ مگر ٹام پین نے اپنا عقل اور فہم کبھی بھی سامعین کی تالیوں کے ہاں رہن نہ رکھا۔ چنانچہ وہ تو اس تجویز کے برعکس لوگوں سے بحثیں کر رہا تھا کہ وہ ماضی کو بھلا کر ایک نیا معاشرہ قائم کریں۔ ایک مساوات اور عدل بھرا معاشرہ۔ اس نے فرانس کے تختہ الٹے بادشاہ کو پھانسی کی سزا دینے کے خلاف ووٹ دیا۔ ایک تو اس لیے کہ فرانس کے اِس بادشاہ نے امریکی انقلاب کی مدد کی تھی جس کے لیے جارج واشنگٹن سے لے کر تھامس پین تک سب انقلابی اس کے احسان مند تھے۔ اور دوسرا اس لیے کہ پین ویسے ہی سزائے

موت کے خلاف تھا۔ اس نے مقبولِ عام اکثریت کے خلاف جانے کا فیصلہ کر لیا اور بادشاہ کو سزائے موت دینے کے خلاف ووٹ دیا۔ اس نے تو یہ مطالبہ کیا کہ بادشاہ کو امریکہ جلاوطن کیا جائے جہاں وہ بادشاہت کے جرائم اور مصائب سے بہت دور، عوامی بہبود کے مسلسل پہلو سے سیکھ جائے گا کہ حکومتوں کا حقیقی نظام بادشاہوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ یہ شفاف، مساوی، منصفانہ اور باعزت نمائندگی پر مشتمل ہوتا ہے۔

مگر، ساری کوششوں کے باوجود کنونشن نے لوئی شانزدہ کو غدار قرار دے دیا اور اس کے لیے سزائے موت منظور کی۔ 21 جنوری 1793 کو اُسے گلوٹین کے ذریعے قتل کیا گیا۔ اور نو ماہ بعد ملکہ کا بھی یہی حشر ہوا۔

درمیانہ طبقہ کے گرونڈن اپنے انقلاب کے ساتھ وہی کھیل کھیلنے لگے جو بیسویں صدی کے اواخر میں ہم بلوچوں اور ہمارے پڑوسیوں جیسے ممالک کے لوگ کھیل رہے ہیں۔...... کسی طرح کے دوست اپنانے کی بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا کھیل۔ 'یہ' انقلاب کا کیتھولک ہے، 'وہ' انقلاب کا پروٹسٹنٹ، یہ غدار ہے، وہ جاسوس۔ یہ اصلی ہے، وہ نقلی۔ یہ سُچا ہے وہ ناخالص.......... اور اس کھیل میں وہی عنصر تباہ حال ہوا جس کے لیے انقلاب لایا جا چکا تھا، یعنی عوام۔ پین کو اندازہ ہو گیا کہ فرانس میں انقلاب ٹیڑھا پڑ گیا تھا۔

ایسے میں جیکو بنوں نے اسمبلی میں کودتا کر دیا۔ نتیجے میں گیرونڈن پارٹی کو زوال ہوا۔ اور ریڈیکل رابس پائیرے کا گروہ حاوی ہو گیا۔ اِن انتہا پسندوں نے گیرونڈن والوں کو قومی اسمبلی سے نکال باہر کر دیا۔ اور اقتدار پر قابض ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ریڈیکل معاشی وسماجی پالیسی اپنائی۔ امیروں پر ٹیکس لگائے، غریبوں معذوروں کو قومی امداد دی، تعلیم کو مفت اور لازمی کر دیا اور غیر ملکیوں کی جائیداد قبضہ میں لے لی۔ جیلیں قیدیوں سے بھر گئیں، کوئی ٹرائل اور مقدمہ بازی نہیں۔...... بس 'یہ گلٹی' (مجرم)، 'یہ ناٹ گلٹی'۔ تقریباً تین لاکھ افراد کو گرفتار کیا گیا اور سترہ ہزار کو سزائے موت دے دی گئی۔

ایسے میں تھامس پین نہ تو یہاں کا رہا تھا، نہ وہاں کا۔ وطن پہلے چھوٹ چکا تھا۔ یہاں جس

انقلاب کے لیے اُس نے دن رات ایک کیا تھا، وہ طفلی ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ انقلابیوں کی باہمی برادر کشی جاری تھی ۔ ہر شخص بقول حافظ ' طوقِ زریں ہمہ درگردن خرمی بینم' بن چکا تھا۔ ....آخری حد یہ ہوگئی کہ اسمبلی کے اندر بائبل کی افادیت سے انکار کیا گیا۔ عقیدہ کو ملک بدر کیا جا رہا تھا۔ پین یہ سب کہاں برداشت کرسکتا تھا۔

خود پین کو بھی اپنی گرفتاری اور سزائے موت صاف نظر آ رہی تھی۔ فرانس پہ انقلاب 'اصلی، وڈا، اور سُچا' کے نام پہ ایک بہت سخت گیر شخص حکمران تھا، رابس پائیر نام کا۔ وہ دور جسے The Terror کہا جاتا ہے۔ پین کی قسمت پہ تاریکیاں چھانے لگیں۔ امریکہ میں اب رجعتی اور قدامت پرست لوگ اقتدار میں گھس آئے تھے۔ اور اُن میں سے مورس نامی ایک انقلاب دشمن (پین دشمن) شخص کو فرانس میں امریکہ کا سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ پین کے دوست اُس تیزی سے کٹ مر رہے تھے جس تیزی سے گلوٹین کام کرسکتا تھا۔ وہ بھی ہر روز اپنے لیے یہی خدشہ رکھتا تھا۔ اسے مکمل احساس ہوگیا کہ فرانس نے واقعتاً ایک شروع ہونے والے انقلاب کو برباد کردیا، اور انہی کو تباہ کردیا جنہوں نے یہ انقلاب پیدا کیا تھا۔ تب اس نے لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ایسے وقت لکھنے کا فیصلہ کیا جب دائیں بائیں موت نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس نے تیزی سے اور بغیر لمحہ ضائع کیے لکھنا شروع کیا، لکھتا ہی رہا، لکھتا ہی رہا، اُسے نام دیا تھا: **دلیل کا زمانہ** ۔

حوالہ جات

1- پیپوس۔ جے ڈی۔ Tom Pain روپا اینڈ کمپنی، نیودہلی، 2002، صفحہ 39

دلیل کا زمانہ

''مجھے آتشیں الفاظ سے لکھنا ہے، اس لیے کہ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں کل مرجاؤں گا، یا اگلے دن۔ موت اس قدر زیادہ ہوئی کہ میں اُس کا حصہ بن چکا ہوں، اور یوں میں اپنے خوف کو گم کر چکا ہوں۔ انہوں نے مجھے بھاگ جانے کا کہا، مگر پین کہاں جاسکتا ہے؟۔ امریکہ؟ نہیں..........امریکہ میں آج ایک بوڑھے انقلابی کی ضرورت نہیں ہے.......... پتہ نہیں وہ امریکہ میں مجھے پہچانیں گے بھی یا نہیں؟۔ ورنان کا طویل قامت ساتھی (جارج واشنگٹن) وہ سپاہی نہیں ہے جسے میں کبھی جانتا تھا۔ وہ بھول چکا ہے کہ ہم نے کس طرح جرسی میں سے مارچ کیا تھا۔..........کیا میں انگلینڈ جاسکتا ہوں؟۔ وہ تو اب سے سو سال بعد مجھے اُس سرزمین پر خوش آمدید کہیں گے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میرا کام فرانس میں ہے۔ اور فرانس کو دنیا کا نجات دھندہ ہونا ہوگا، اور اگر وہ پین کی جان لے لیں تو کیا نقصان ہے؟''۔

ٹام پین لکھتا رہا۔ اُسے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں، کھانے دھونے کی کوئی فرصت نہیں، وہ بس لکھتا ہی رہا۔ اس نے پہلا صفحہ یوں لکھا:

''ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھی سٹیزنوں کے نام!

''میں یہ تصنیف تمہاری حفاظت میں رکھتا ہوں۔ اس میں دھرم کے بارے میں میری رائے موجود ہے۔ آپ یہ یاد رکھ کر میرے ساتھ انصاف کریں گے کہ میں نے ہمیشہ ہر آدمی کی اپنی رائے رکھنے کے حق کی پرزور حمایت کی، خواہ وہ رایہ میری رائے سے کتنی مختلف کیوں نہ ہو۔ جو شخص

دوسرے انسان کے اس حق سے انکار کرتا ہے، وہ خود کو اپنی موجودہ رائے کا غلام بنا ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کو اُسے تبدیل کرنے کے حق سے محروم کر لیتا ہے۔

''ہر طرح کی غلطیوں کے خلاف سب سے موثر ہتھیار دلیل ہے۔ میں نے کوئی اور ہتھیار استعمال نہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی کبھی نہیں کروں گا۔

تمہارا پیارا دوست اور ساتھی سٹیزن،

تھامس پین۔ 27 جنوری 1794''

''پچھلے کئی سالوں سے میرا ارادہ رہا کہ دھرم کے بارے میں اپنے خیالات لکھوں۔ مجھے اُن مشکلات کا بخوبی ادراک ہے جو اس موضوع کے اندر موجود ہیں، اور اسی وجہ سے میں نے اسے زندگی کے زیادہ پکے حصے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ میری آخری پیش کش ہوگی، جو میں ساری اقوام کے اندر موجود اپنے ساتھی سٹیزنوں کو پیش کروں گا۔

''فرانس میں پادری گیری کے سارے قومی نظام اور دھرم کے جبری نظاموں سے متعلق ہر چیز اور ہر عقیدے کے جبری دفعات کے مکمل خاتمے پر، اب جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس نے نہ صرف میرے ارادے کو مضبوط کر دیا بلکہ اِس طرح کی ایک تحریر کو بے حد ضروری بنا دیا۔ خدانخواستہ توہم پرستی، جھوٹے نظامہائے حکومت اور نقلی دینیات کے عمومی کھنڈر میں، ہم اخلاقیات، انسانیت اور اُس دینیات کی بصارت کو کھو نہ ڈالیں جو کہ سچی ہے۔

''جس طرح کہ میرے کئی ساتھیوں نے، اور فرانس کے میرے دوسرے ساتھی سٹیزنوں نے عقیدے کو اپنا رضا کارانہ اور انفرادی معاملہ بنانے کی مثال پیش کر دی، میں بھی اپنا عقیدہ بناؤں گا اور ایسا میں بھرپور اخلاص اور بے باکی کے ساتھ کروں گا۔

''میں ایک خدا پہ یقین رکھتا ہوں، اور بس۔ اور میں اِس حیات سے بعد کی خوشی کی امید رکھتا ہوں۔

''میں انسان کی مساوات پر یقین رکھتا ہوں۔ اور یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ مذہبی فرائض انصاف کرنے، رحم کرنے اور اپنے ساتھی مخلوقات کو خوش رکھنے کی محنت پر مشتمل ہیں۔

''مگر، خدانخواستہ یہ فرض نہ کیا جانا چاہیے کہ اِن چیزوں کے علاوہ بھی میں کسی چیز پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اس تحریر کی بڑھوتری کے اندر اُن چیزوں کا اعلان کروں گا جن پر میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ اور اُن پر عقیدہ نہ رکھنے کے لیے اپنے دلائل کا اعلان کروں گا۔

''میں یہودی چرچ، رومن چرچ، یونانی چرچ، ٹرکش چرچ، پروٹسٹنٹ چرچ کی طرف سے دعویٰ کردہ عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی بھی چرچ کی طرف سے جسے میں جانتا ہوں۔ میرا اپنا دماغ ہی میرا چرچ ہے۔

''چرچوں کے سارے قومی ادارے، مجھے انسان کے گھڑے ہوئے سے زیادہ نہیں لگتے، تاکہ بنی نوع انسان کو خوفزدہ اور غلام کیا جائے اور اقتدار و منافع پر اجارہ قائم کیا جائے۔

''اس اعلان سے میرا مطلب اُن لوگوں کو مسترد کرنا نہیں ہے جو دوسری طرح عقیدہ رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے عقیدے پر وہی حق حاصل ہے جو مجھے اپنے عقیدے پر ہے۔ مگر انسان کی مسرت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ذہنی طور پر اپنے آپ سے وفادار ہو۔ کفر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے میں نہیں ہے، یہ اس چیز پہ عقیدہ رکھنے کی تبلیغ کرنے میں ہے جس پر وہ عقیدہ نہیں رکھتا۔

''یسوع عمدہ ترین اخلاقیات، اور انسانی مساوات کا درس دیتا تھا۔ مگر وہ یہودی ملاؤں کے کرپشنوں اور لالچوں کے خلاف بھی درس دیتا تھا۔ اسی وجہ سے تو ساری ملائیت اس سے نفرت اور حسد کرنے لگی۔ اُن ملاؤں نے اس کے خلاف جو الزامات لگائے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ رومن حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کر رہا ہے (اُس زمانے میں یہودی رومن حکومت کی رعایا تھے)۔ اسی وجہ سے رومن حکومت بھی اس کے نظریے کے خلاف خدشات رکھتی تھی۔ یہ بھی ناممکن نہیں کہ یسوع مسیح بھی یہودی قوم کو رومنوں کی زنجیروں سے آزاد کرنے کا سوچ رہا تھا۔ بہر حال، ان دونوں کے درمیان یہ خیر آور مصلح اور انقلابی، اپنی زندگی دے بیٹھا۔

''اخلاقی شرارت کا حساب کتاب کرنا ناممکن ہے۔ جب کسی شخص نے اپنے دماغ کی پاکیزگی کو اس قدر کرپٹ اور رنڈی بنالیا ہو کہ اپنے عقیدے کو اُن چیزوں کے حوالے کر دے جن پر وہ عقیدہ نہیں رکھتا، تو اس نے گویا خود کو دوسرے ہر جرم کے کرنے کے لیے تیار کر لیا ہے۔ وہ فائدہ

حاصل کرنے کے لیے پادری کا پیشہ اختیار کرتا ہے، اور خود کو اُس پیشے کے لیے موزوں ثابت کرنے کے لیے وہ اپنے حلف اور قسم سے پھر جانے سے شروعات کرتا ہے۔ کیا ہم اخلاقیات کے لیے اس سے بڑی کسی اور تباہ کن چیز کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟۔

''امریکہ میں پمفلٹ **کامن سینس** چھاپنے کے فوراً بعد میں نے اس بات کا بڑھتا ہوا امکان دیکھا کہ 'نظامِ حکومت' میں ایک 'انقلاب' کے بعد نظامِ دھرم میں ایک تبدیلی آئے گی۔ چرچ اور ریاست کے بیچ ایک فاحشہ والے تعلق نے دکھوں اور جرمانوں کے ذریعے قائم عقیدوں پر ہر بحث کو، اور دھرم کے اولین اصولوں کو، اس قدر موثر طور پر ممنوع کر دیا، کہ جب تک نظامِ حکومت تبدیل نہ کیا جائے، اُن موضوعات کو دنیا کے سامنے عمدگی اور کھلے طور پر نہیں لایا جاسکتا۔ اور یہ کہ جب بھی یہ کیا جائے گا تو اس کے بعد ہی نظامِ دھرم میں ایک تبدیلی آئے گی۔ انسانی ایجادات اور پادری کے کرافٹ کا پتہ لگایا جائے گا۔ اور انسان ایک خدا پر خالص اور بے ملاوٹ یقین رکھنے کو لوٹ آئے گا، بس۔

''ہر قومی چرچ یا دھرم نے خود کو اس طرح قائم کیا کہ گویا خدا نے کوئی خاص مشن کچھ افراد کو سونپ دیا ہو............''۔

جیسے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ فرانس کا انقلاب اپنی متعین راہ سے ہٹ چکا تھا۔ اب تو گلوٹین تھا، دہشت تھی۔ پین نے اپنے قریب ترین دوستوں کو تباہ ہوتے، جیلوں میں سڑتے ہوئے دیکھا۔ خود اُسے خطرہ اپنی طرف بڑی تیزی سے آتے محسوس ہوا۔ ایک انقلاب پاگل ہو چکا تھا۔ جی ہاں، انقلاب بھی پاگل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے یہیں اپنے ہاں، اور اپنے پڑوس میں بھی انقلابوں کو پاگل ہوتے دیکھا ہے۔ 'یہ غدار ہے، وہ ایجنٹ ہے، اِسے قتل کردو، اُسے گولی ماردو!!'۔

انقلاب کو پاگل بنانے والے رابس پائرے کی آمریت نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کی پیدائش انگلینڈ کی ہو، اُن سب کو گرفتار کیا جائے۔ مگر پین اِس قانون کی زد میں اس لیے نہ آیا کہ وہ صرف پیدائشی انگلش تھا، اُس کی شہریت تو امریکہ کی تھی۔ جی ہاں، وہ امریکی شہری تھا۔ مگر اُس

سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تو فرانس کی پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے اُس کی ممبری ختم کی جائے اور پھر اُسے گرفتار کر کے موت کی سزا (گلوٹین) دی جائے۔

چنانچہ، اُس سال دسمبر کے اواخر میں قرار داد منظور ہوئی کہ غیر ملکی لوگ اب فرانس اسمبلی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ دو ہی تو ممبر تھے: انارکسٹ کلوٹس اور خود ٹام پین۔ اسی سے ٹام کو اندازہ ہوا کہ اُس کے پاس آزادی کے محض چند دن ہیں۔ اس لیے وہ دوبارہ لکھنے بیٹھا اور تیز رفتاری سے اُسے مکمل کرنے لگا۔ اس کے پاس بائبل نہ تھا کہ اُس سے مدد لیتا۔ بس یادداشت سے مدد لیتے ہوئے وہ برق رفتاری سے کام کرتا رہا............ اور اپنی گرفتاری کے چھ گھنٹہ قبل اُس نے اپنے پمفلٹ **دلیل کا زمانہ** کا پہلا حصہ مکمل کیا۔

وہ 28 دسمبر 1793 میں ریپبلک کے خلاف سازش کے الزام میں گلوٹین ہونے کے لیے گرفتار ہوا، رات کو تین بجے۔ بس یہ رعایت ہوئی کہ جیل جاتے ہوئے راستے میں وہ اپنے **دلیل کا زمانہ** نامی مسودے کو بارلاؤ کے حوالے کرنے میں کامیاب ہوا۔ تاکہ وہ اِسے پبلشر تک پہنچائے۔

پین اس پمفلٹ کی اگلی جلد میں بتاتا ہے کہ لگزمبرگ جیل کے افسر بینوئٹ اس سے بہت احترام سے پیش آیا۔ گرفتار کیے جانے کا سارا واقعہ اس نے **دلیل کا زمانہ** کے حصہ اول کے سیکشن 15 میں بیان کیا۔

جیل تو برباد کر کے چھوڑتا ہے۔ اُس کے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی اثرات زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں۔ مگر ٹام پین جیسے انسان کی بابت سمیع القاسم کا یہ مشاہدہ ہی حقیقت ہے:

مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے
کہ ان کے بس میں نہ گیت میرے، نہ پھول میرے، نہ میری چاہت
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے!
کہ دسترس میں نہیں ہیں ان کی
وہ کُنجیاں، جن سے میری جیبیں بھری ہوئی ہیں

مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے، نہ ان فصیلوں
میں بربرّیت کے شاہکاروں کا خوف کوئی
کہ جب بھی چاہوں
نئی مسرت سے پُر زمینوں کی سُرخ مٹّی میں منہ چھپانا
ہے میرے بس میں

چنانچہ یہاں، ٹام پین ہے۔ اپنی تقدیر کے سامنے نہ جھکتا ہوا ٹام پین۔ وہ اپنی زندگی کے لیے اپنی قوت سے بڑھ کر لڑا۔ جیل میں سے پین نے فرانس میں موجود امریکی سفیر سے اپنی رہائی کی مدد مانگی۔ وہ امریکی شہری جو تھا۔ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ وہاں ایک ایسا شخص سفیر تھا جس کے ساتھ انقلاب کے دوران پین کے شدید اختلافات رہے تھے۔ دشمنی کی حد تک اختلافات، اس لیے کہ سفیر موریؔس امریکہ میں ایک انقلاب دشمن ذخیرہ اندوز تھا۔ اُس پہ وہاں جو مقدمہ چلا تھا اور جو سزا ہوئی تھی، اُس جیوری میں پین بھی شامل تھا۔ چنانچہ سفارش کی بجائے سفیر صاحب نے اسے مزید برباد کرنے کے لیے کام کیا۔ اس نے اتمامِ حجت کے بطور اپنے امریکی صدر جیفرسن کو لکھا:

''......تھامس پین جیل میں ہے، جہاں وہ جیزس کرائسٹ کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کر کے خود کو لطف دیتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آیا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا یا نہیں، کہ اسے بقیہ قیدیوں کے ساتھ سزائے موت دی جا چکی ہوتی، اگر مخالف پارٹی اُسے ہتک سے نہ دیکھتی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ جیل میں خاموش ہو تو اُسے فراموش کر دیے جانے کی خوش قسمتی ملے گی۔ جبکہ اگر اُسے زیادہ نوٹس میں لایا جائے، تو طویل عرصہ سے معطل کلہاڑی اس پر گر سکتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی امریکی شہریت کا دعویٰ کر دوں، مگر اس کی پیدائش کا سوچ کر، اس ملک میں اس کی شہریت کے حقوق لینے اور جو جگہ اس نے پُر کی ہے، اس کو مدنظر رکھ کر میں زیادہ حق پہ شبہ کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ دعویٰ، کم از کم اس وقت، خلافِ مصلحت اور غیر موثر ہوگا......''۔

نہ صرف یہ بلکہ اس نے طریقے طریقے سے فرانسیسی حکومت کو بھی جتلا دیا کہ اگر پین کو گلوٹین (سزائے موت) کیا جائے تو امریکہ کو کوئی خاص اعتراض نہ ہوگا۔

اُدھر، اگست 1795 میں ٹام پین **دلیل کا زمانہ** کا دوسرا حصہ مکمل کرتا ہے۔ ٹام پین قدیم اساطیر کا حوالہ دیتا ہے جہاں دکھایا گیا کہ دیوؤں کی دوڑ نے جوپیٹر دیوتا کے خلاف جنگ کرائی، اور اُن میں سے ایک نے اُس پر ایک ہی اچھال میں سو چٹانیں پھینک دیں۔ جوپیٹر نے اُسے گرج سے شکست دی اور بعد میں اسے ایٹنا نامی پہاڑ میں محدود کر دیا۔ اب جب بھی یہ دیو پہلو بدلتا ہے تو کوہِ ایٹنا آگ اگلتا ہے۔ پین اُسے ایک فرضی کہانی قرار دیتا ہے اور پہاڑ کو ایک آتش فشانی پہاڑ کہتا ہے۔ پین نے کہا کہ اسی طرح کی اساطیری کہانیاں بڑھتے بڑھتے اپنی شکلیں بدلتی جاتی ہیں اور ہر علاقے کے عقیدے میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔

پادریوں نے اتنی مکاریاں کیں اور انسانیت سے کرپشن اور سفا کی کرنے والوں کے ہاتھ اس قدر مضبوط کیے کہ یہ دنیا لگتا ہے بھگوان کی نہ ہو، شیطان کی ہو۔

یہاں ٹام پین فلسفہ کے بنیادی سوال کو چھیڑتا ہے۔ بہت تفصیل کے ساتھ۔ چونکہ وہ مسیحیت والے لوگوں سے مخاطب ہے، اس لیے اُس کے سارے دلائل، حوالے اور توضیحات بائبل سے ہیں۔

ٹام پین فانی پن اور لافانی پن کے بارے میں اس قدر گہری اور فلسفیانہ باتیں کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے: ''..........دنیا میں ہر جانور ہم سے کسی نہ کسی چیز میں افضل ہے۔ پروں والے کیڑے، آدمی کی نسبت بہت آسانی سے اور بہت بڑا علاقہ عبور کر سکتے ہیں۔ چھوٹی ترین مچھلی کی گلائیڈ، اس کی جسامت کے تناسب سے ہم انسانوں سے زیادہ رفتار دکھاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سست ترین سست رو گھونگھا ایک تہہ خانے کی تہہ سے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ جہاں ایک انسان ختم ہو سکتا ہے، اور ایک مکڑی خود کو چوٹی سے ایک دلکش خوش باشی کے ساتھ اتار کر سکتی ہے۔ انسان کی شخصی قوتیں بہت محدود ہیں......

''یہ کائنات کا ڈھانچہ ہے جس نے یہ علم انسان کو سکھایا۔ وہ ڈھانچہ ہر اُس اصول کی ہمہ وقت موجود نمائش ہے جس پر ریاضی والے سائنس کا ہر حصہ مبنی ہے۔ اس سائنس کی اولاد مکینکس ہے۔ اس لیے کہ مکینکس سائنس کے اصولوں کے عملی اطلاق کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو شخص ایک مشین

کے کئی پرزوں کو متناسب انداز میں وضع کرتا ہے، وہ یہی سائنسی اصول استعمال کرتا، اگر اُس کے پاس ایک کائنات بنانے کی قوت ہوتی۔

''مگر چونکہ وہ مادہ کو، نظر نہ آنے والی وہ ایجنسی نہیں دے سکتا جس سے کہ کائنات کی ساری عظیم الجثہ مشین کے کل پرزے ایک دوسرے پر اثر رکھتے ہیں، اور باہم مل کر حرکتی اشتراک سے عمل کرتے ہیں، اور جنہیں انسان نے کشش، کششِ ثقل اور دُور دھکیلنے (Repulsion) کا نام دیا ہے............ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان ایک پہیہ اور محور (Axis) بنا سکتا ہے، وہ مختلف جسامت کے پہیوں کو باہم جوڑ سکتا ہے اور ایک مشین پیدا کرسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس نے وہ اصول نہیں بنائے جو پہیوں کو وہ قوت دے سکتے ہیں۔ اصول ناقابلِ تغیر ہیں............ یونانیوں کی ترقی کا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان کے علم کی ایک وجہ یہی تھی۔ بہتر مطالعہ کے لیے اُن کا کافی وقت بچا۔ یونانیوں کے سکول زبانوں کے سکول نہ تھے بلکہ سائنس اور فلسفہ کے سکول تھے۔ فلسفہ اور سائنس ہی چیزوں کا علم سکھاتے ہیں۔ آج ہمارے پاس جو بھی سائنسی معلومات ہیں تقریباً سب کا سب یونانیوں سے آیا، اُن لوگوں سے جو یونانی زبان بولتے تھے۔ چنانچہ دوسری قوموں نے یونانی زبان میں موجود علم کے خزانوں کو اپنی مادری زبانوں میں ترجمہ کیا''۔

ٹام پین مردہ زبانوں کے سیکھنے کو بے کار قرار دیتا ہے۔ وہ زندہ زبانوں میں علم کا وسیع ذخیرہ دیکھتا ہے جس نے کہ مردہ زبانوں کے تراجم بھی خود میں سمو رکھے ہیں۔ زندہ زبان ہمیشہ سائنسی زبان ہوا کرتی ہے۔ وہ یہاں گلیلیو کی سائنسی دریافتوں کو سراہتا ہے اور اس پر پادریوں کی طرف سے الزامات کا تذکرہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ورجی لیس کا تذکرہ بھی احترام سے کرتا ہے۔ جسے صرف اس لیے زندہ جلا دیا گیا کہ اس نے کہا کہ ''زمین گول ہے''۔

ٹام پین بتاتا ہے کہ دنیا کا وہ حصہ جسے نظامِ شمسی کہا جاتا ہے (دنیاؤں کا وہ نظام جس میں ہماری زمین شامل ہے اور سورج (Sun, Sol) جس کا مرکز ہے) اس میں چھ نمایاں اجرامِ فلکی، یا اجسامِ فلکی، یا دنیائیں بھی ہیں، اُن کے علاوہ سیٹلائٹ یا چاندوں جیسی ثانوی بھی، جن میں ہماری زمین بھی ایک رکھتی ہے جو سورج کے گرد اس کی سالانہ والی گردش میں اُسے حاضری دیتی ہے

............سورج مرکز ہے جس کے گرد مختلف فاصلوں میں وہ چھ دنیائیں یا اجرامِ فلکی گھومتے ہیں۔ ہر دنیا اپنی رفتار اور اپنے راستے پر سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اور بہ یک وقت اپنے گرد بھی تقریباً ایک عمودی حالت میں، جس طرح ایک لٹو خود اپنے گرد گھومتی ہے جب یہ زمین پر تیزی سے گھوم رہی ہو، اور ذرا سا پہلو کی طرف جھک جائے۔ زمین کا یہ جھکاؤ ہے (23.5 ڈگری) جو موسم گرما اور سرما، اور دنوں اور راتوں کی مختلف طوالت کا سبب بنتا ہے۔ اگر زمین اپنے گرد دائرے کی سطح کو ایک عمودی پوزیشن میں رکھے تو یہ سورج کے گرد ایسے حرکت کرتی ہے، جیسے ایک لٹو گھومتی ہے۔ اگر یہ لٹو زمین پر سیدھا کھڑا ہوتا تو دن اور رات ہمیشہ ایک لمبائی کے ہوتے، بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات، اور موسم پورے سال ایک جیسے رہتے۔ ہر بار جب ایک سیارہ (مثلاً ہماری زمین) اپنے گرد گھومتا ہے تو یہ دن اور رات بناتا ہے، اور ہر بار جب یہ سورج کے گرد گھوم لیتا ہے تو یہ سال بناتا ہے۔ چنانچہ ہماری دنیا سورج کے گرد ایک بار گھومتی ہوئی 365 بار اپنے گرد گھوم لیتی ہے۔

پمفلٹ کا آخری فقرہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

''میں اپنی تصنیف کے آخر میں تجویز کردہ خیالات قاری کے ذہن پر نقش ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہوں، کہ جب آرا (خواہ دھرمی معاملات کی ہوں یا حکومتی امور سے متعلق) آزاد ہوں گی، تو سچ بالآخر طاقت ور طور پر بالادستی پائے گا''۔

لگزمبرگ جیل

پین تقریباً سال بھر تک لگزمبرگ جیل میں پڑا موت کے انتظار میں سڑتا رہا۔

1790 کی دہائی کے اواخر میں اُس کے پمفلٹ کا حصہ سوم مکمل ہو چکا تھا مگر تھامس جیفرسن نے پین کو قائل کیا کہ اسے فی الحال نہ چھاپے اس لیے کہ اُسے انتقامی کاروائی کا خدشہ تھا۔ پانچ سال بعد پین نے سب خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے چھاپنے کا فیصلہ کرلیا۔

پین شخصی حکومت کی زبردست مخالف کرتا ہے۔ وہ ایک شخص کے پاس بہت سارے اختیارات جمع ہونے مرکوز ہونے کی زبردست مخالفت کرتا ہے۔ اس نے واشنگٹن کو خط لکھ کر اس کی انتظامیہ کی غلطیاں بتائیں: ’’انقلاب میں حاصل کردہ زمینیں جانب داری سے بانٹ دی گئیں، غیر مسلح کردہ سپاہی کے مفادات کو بیچ دیا گیا، عقیدہ کے سائے تلے ناانصافی کی گئی اور چیف آف آرمی فراڈ کا سرپرست بنا۔ ایک قوم کی توہینوں کے سامنے غلامانہ گھٹنے ٹیکنا، دوسری قوم سے غداری اور ناشکرگزاری......بھگوڑوں نے تم میں حفاظت پالی ہے۔‘‘ ۔اس نے اپنے خط کو ان الفاظ پہ ختم کیا: ’’

دنیا یہ فیصلہ کرتے وقت مخمصے میں رہے گی کہ آیا تم اپنے اصولوں سے ایک مرتد ہو، یا ایک دھوکے باز ہو۔ آیا تم نے اچھے اصول ترک کردیے یا کہ تمہارے پاس اچھے اصول تھے ہی نہیں‘‘۔

وطن پرست ٹام پین قید میں پڑا موت کا انتظار کررہا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ پین کا خیال تھا کہ جارج واشنگٹن اُسے ترک کر چکا تھا۔ مگر وہ صرف اسی وجہ سے واشنگٹن سے ناراض نہ تھا۔ بہت سے لوگوں حتیٰ کہ ہاورڈ فاسٹ نے بھی اس کے سوانحی ناول میں یہ تاثر دیا ہے۔ مگر یہ تو بہت ہی حقیر بات تھی۔ ٹام پین جیسا شخص اتنی چھوٹی بات کو تیسرے شخص کے سامنے کبھی نہ لائے گا۔ اُس نے خود بھی اپنے خط میں اس تاثر کو مسترد کیا۔ یہ درست بات ہوتی کہ جونھی امریکی حکومت کو اپنے اس شہری کی فرانس میں گرفتاری کی خبر ملی تو اُسے اس معاملے میں تفتیش کرنا چاہیے تھی۔ گلہ تو پین کو واشنگٹن سے تھا جو اگر دوست نہ تھا تو پین کا واقف کار ضرور تھا (بقول پین، واشنگٹن کو جاننے والے کہتے ہیں کہ کچھ عرصے سے اُس کا کوئی دوست نہ تھا)۔ اخلاقی اور قانونی، ہر لحاظ سے اُس کی اور اس کی حکومت کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنے شہری کی گرفتاری اور ممکنہ ہلاکت پر حرکت میں آتے۔ (اور پھر پین کو تو اس نے کئی بار امریکہ کا محسن کہا تھا، پین جنگِ آزادی میں اُس کے شانہ بشانہ لڑا تھا)۔ دراصل واشنگٹن تباہ کن راہ پر چل پڑا۔ واشنگٹن انقلاب کی راہ سے گم راہ ہو چکا تھا۔ اس کی حکومت کو رجعت کے سیاہ بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ صدارت کی کرسی پر چڑھ کر واشنگٹن نے امریکہ کی آزادی کی ہر پیش قدمی کو اپنے نام کرنا شروع کیا۔ اس نے ساری داد، ساری تحسین اپنے کھاتے میں ڈال دی۔ حتیٰ کہ اس کے نائب صدر نے تو اُس کی حکمرانی کو موروثی قرار دینے تک کی کوشش کی۔

چیونٹی کی رفتار سے دن گزرتے گئے اور زندگی یکسانیت کی صدیوں پرانی ڈگر پر چل رہی تھی......پین کڑھتا رہا، جیتا رہا۔ جیتا رہا، مرتا رہا۔ اُسے سب سے زیادہ گلہ اپنے سابقہ ساتھی اور موجودہ صدر امریکہ جارج واشنگٹن سے تھا۔ وہ شخص نہ صرف اپنی راہ سے ہٹ چکا تھا بلکہ پین کو بری طرح نظر انداز کر چکا تھا۔ تلخ ہوتے ہیں یاروں کی نظریں پھیرنے کے دہکتے انگارے!۔ پین نے اس کے خلاف اتنے مضامین و خطوط لکھے کہ امریکہ کو بھی برا لگنے لگے۔ پین وہاں اب اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

پین نے واشنگٹن کو دوسرا خط 20 ستمبر 1795 کو لکھا جس میں اس نے تصدیق چاہی کہ آیا امریکی حکومت، یا خود اُس نے، اپنے شہری پین کی فرانس میں گرفتاری کے خلاف کوئی اقدام کیا۔ اور اسے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ اس سے جھگڑنا ہوگا، اس پہ یہ الزام لگاتے ہوئے کہ اس نے اُن کی دوستی سے دغا کی تھی اور ملک کے صدر کی حیثیت سے منافقت کی تھی۔ اس دوران اس نے امریکہ اور فرانس کے پریس میں واشنگٹن کے خلاف کالموں کے کالم لکھے۔

پین وہیں جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ اس کے ساتھی، دوست اور ہم خیال ایک ایک کر کے قتل گاہ لے جائے جاتے رہے۔ کوئی بھی واپس نہ آیا۔ وہ بھی اپنی موت کی گھڑیاں گن رہا تھا......

اور پھر ایک روز خبر آئی کہ اُس کے سب سے بڑے مخالف اور فرانس کے مضبوط ترین حاکم، رابس پائرے کا تختہ 27 جولائی 1794 کو الٹ دیا گیا اور اگلے دن کنونشن کی طرف سے رابس پائرے کو سزائے موت سنا دی گئی۔ فرانس کی مشہورِ زمانہ 'دہشت' ختم ہو چکی ہے۔ ساتھ میں امریکی سفیر بھی تبدیل ہو گیا اور نئے شریف آدمی نے فرانس پہنچتے ہی پین کے کیس کو اٹھا لیا۔

فرانس کی اسمبلی کو بھی احساس ہوا کہ ٹام سے بدترین ناانصافی کی گئی۔ یوں، اسمبلی نے نومبر 1794 میں اُسے رہا کر دیا۔ فرانسیسیوں نے اپنا تھوک واپس چاٹتے ہوئے اُس کی اسمبلی ممبری بھی بحال کر دی۔

دس ماہ موت کے دروازے پہ پڑے رہنے والے ٹام پین نے اپنے مصائب کو فراموش کر دیا۔ کسی کے خلاف شکایت نہ کی۔ کسی انتقام کا ارادہ نہ کیا۔ اُس نے پارلیمنٹ کو ایک خط میں یہ ساری باتیں بتا دیں اور اُس میں اپنی ممبری کی دوبارہ بحالی قبول کر لی۔

''میرا ارادہ اسمبلی کی دعوت قبول کرنے کا ہے۔ اس لیے کہ میں خواہش رکھتا ہوں کہ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ گو کہ میں ناانصافی کا شکار ہوا ہوں، میں اپنے مصائب کو اُن لوگوں سے منسوب نہیں کرتا جن کا اُن مصائب میں ہاتھ نہ تھا، اور میں حتیٰ کہ ان لوگوں کے خلاف بھی کوئی انتقامی اقدام کے استعمال سے دور ہوں جو اُن مصائب کے مصنف ہیں۔''

اور یوں، پین پھر اسمبلی پہنچا۔ مگر خالی ہاتھ نہیں۔ وہ انسانیت کو عطیہ کرنے ہمیشہ کچھ نہ کچھ

پیش کرتا تھا۔ اب کے وہ آتا ہے اور اسمبلی میں اِس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ ووٹ دینے کا حق صرف جائیداد رکھنے والوں کو ہو۔ وہ ہر بالغ انسان کو ووٹ کا حق دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس کا پمفلٹ انگلینڈ اور امریکہ میں بھی چھپ گیا تھا۔ اب اُس نے بائبل دوبارہ پاس رکھی اور اپنے سابقہ پمفلٹ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اب کے پین بائبل کا سخت مخالف ہوا۔ یہ ساری معلومات اُس نے اُسی پیش لفظ میں لکھیں۔

اِس میں وہ پادریوں کی ہمیشہ والی اِس عادت پر بحث کرتا ہے جس کے تحت وہ ہر چیز کا ثبوت بائبل میں ڈھونڈتے ہیں۔ یعنی پادری خود کو سائنس وسماج کے ماہر ٹھہراتے ہیں۔ وہی تاریخ دان بھی بنے ہوتے ہیں، اور ماہرینِ فلکیات بھی۔ ٹام مختلف بادشاہوں کی طرف سے اپنے زمانے میں بائبل میں ترامیم کرنے کے واقعات کا بھی اظہار کرتا ہے۔ وہ مسیحی مذہبی معاملات کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے۔ کئی باتوں کو وہ اصلی قرار نہیں دیتا کہ اس کے خیال میں بعد کے بادشاہ اور پادری اُن میں اپنی ضرورتوں کے مطابق بڑے پیمانے پر رد و بدل کرتے رہے۔ یہ کتاب دھرم کو ادارہ بنائے جانے کے خلاف ہے، بالخصوص مسیحی دھرم کو۔

بنیادی طور پر وہ اِس پمفلٹ میں پادریوں کی اتھارٹی کو چیلنج کرتا ہے۔ علمی حوالے سے بھی اور سماجی معاشی حوالے سے بھی۔ ''اوہ پادریو، پادریو! تم ایک بیل سے اپنا موازنہ نہ کرنے پہ بضد ہو، پیداوار کا دسواں حصہ لینے کے لیے''۔ پادری کی جاہلانہ توجیحات کا اس خوب صورت انداز میں مذاق اڑانا کوئی ٹام پین سے سیکھے۔

وہ ہمیں یہ معلومات دیتا ہے کہ آج کا نیویارک شہر نیو امسٹرڈیم کہلاتا تھا جس کا نام، موجودہ نام میں 1664 میں تبدیل ہوا۔ اسی طرح وہ بائبل کے معاملات میں تاریخوں کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ کی رحلت 1451 کو بتاتا ہے جو شوآ حضرت موسیٰ کا وارث تھا۔ وہ واقعات کو جب ان تاریخوں سے ملا کر دیکھتا ہے تو بہت سارا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ ٹام پین کے پمفلٹ کے اس حصے کو مسیحی دوست زیادہ سمجھ سکتے ہیں، کہ اُن کے پاس اس معاملے پر معلومات بہت ہیں۔

یہ اس کا تیسرا بڑا کارنامہ تھا۔ اس کی تمام تر نرم، مہذب اور عزت وتوقیر سے بھرے لب و لہجہ کے باوجود اس تصنیف نے دشمنی کی ایک ایسی فضا تیار کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ نہ صرف امریکہ اور انگلینڈ میں بلکہ خود فرانس میں بھی۔ گالیاں، فتوے، نفرتیں.......... ٹام پین کو اب مکمل طور پر شیطان قرار دیا گیا تھا۔ دُور برطانیہ میں تو اس کی کتابوں کے انبار جلائے جا رہے تھے۔ یہ کتاب چرچ کے سجادہ نشینوں کے خلاف جو تھی۔ فرانس انقلاب تو لا چکا تھا مگر عقل پہ دھرم کی زنجیریں تا حال مضبوطی سے موجود تھیں۔ چنانچہ فرانسیسی آبادی بھی سراپا پنڈت بن گئی۔ دلیل کے جواب میں دلیل نہ ملے تو لوگ بہت ہلکے پن پر اتر آتے ہیں۔ جبکہ ٹام پین نے دھرم کے بارے میں 'آزادانہ عقلی جستجو' کا تقاضا کیا۔

چنانچہ ایسی تحریر نے تو ایک شدید ردعمل ابھارنا ہی تھا۔ ملاّ کو سخت خطرہ محسوس ہوا۔ یک دم مذہب کو ماننے والے پین پر، کفر کے فتوے لگا دیے گئے۔ گو کہ بعد کے، اِن تین سو سالوں میں چرچ نے ٹام پین کی کئی باتوں کو بالآخر مان لیا اور معافی مانگی مگر اُس وقت تو ایسا سوچا تک نہ جا سکتا تھا۔ اور پھر ایسی باتیں کرنے کے لیے نہ صرف دلیل ٹام پین جیسا چاہیے تھی بلکہ جرأت اور بہادری بھی اسی جتنی چاہیے تھی۔ ہر ماوشما اتنی بڑی دشمنی نہیں مول لے سکتا۔

وہ لکھتا رہا۔ واشنگٹن کی بے وفائی کے خلاف۔ امریکہ میں وفاق پرستوں کے خلاف۔ وہ فرانس میں سیاسی معیشت پر عمومی مضامین لکھتا رہا۔ اُس زمانے کے اس کے جو مضامین بہت دلچسپی کے ہیں۔ اُن میں سے ایک زرعی انصاف ہے۔

زرعی انصاف

اس کا (آخری) پمفلٹ **زرعی انصاف** (1795) میں لکھا گیا۔ وہ اُسے جلد چھاپنا نہیں چاہتا تھا مگر جب ایک بشپ کی یہ تقریر پڑھی کہ ''امیر اور غریب پیدا کرنا بھگوان کی دانائی ہے'' تو اس نے اپنا پمفلٹ فوراً شائع کر دیا۔ کیا ریاست (جسے فخریہ، شاید غلط طور پر تہذیب کہا جاتا ہے) نے انسان کی عمومی مسرت کو سب سے زیادہ بڑھاوا دیا یا سب سے زیادہ زخمی کر دیا؟۔ ریاست ایک طرف شاندار صورت گری سے خیرہ کر دیتی ہے، دوسری طرف اسے تباہ حالی کی انتہائی صدمہ پہنچاتی ہیں، دونوں اس نے ہی کھڑے کیے ہیں۔ انسانی نسل کے سب سے امیر اور سب سے بدحال لوگ اُن ممالک میں پائے جاتے ہیں، جنہیں مہذب کہا جاتا ہے۔

غربت، مہذب زندگی کہلائی جانے والی چیز کی پیدا کردہ ہے۔ غربت فطری حالت میں وجود نہیں رکھتی۔ دوسری طرف فطری حالت اُن فوائد کے بغیر ہوتی ہے جو زراعت، آرٹ، سائنس اور مینوفیکچر سے ہوتی ہیں.......... تہذیب، یا جس چیز کو یہ نام دیا گیا ہے، دو طریقہ سے کام کرتی رہی ہے؛ سماج کے ایک حصے کو امیر تر بنانا، اور دوسرے حصے کو مزید تباہ حال بنانا۔

فطری حالت سے مہذب حالت تک جانا ہمیشہ ممکن ہوتا ہے مگر مہذب حالت سے فطری

حالت پر جانا ناممکن ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کو فطری حالت میں شکار پر گزارہ کرتے ہوئے اپنا گزارہ حاصل کرنے کو اُس سے دس گنا بڑی زمین کی ضرورت ہوتی ہے، جو کہ مہذب حالت اسے دیتی ہے جہاں پہ کہ زمین کاشت ہوتی ہے۔ اس لیے جس وقت ایک ملک تہذیب، آرٹ اور سائنس کی اضافی مدد سے آباد ہوتا ہے تو وہاں چیزوں کو بچا بچا کر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر آبادی کے دسویں حصے تک کا گزارہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ فطری حالت سے مہذب کہلائے جانے والی حالت تک آنے میں سماج کے اندر پیدا ہونے والی برائیوں کا تدارک کیا جائے، اور فوائد کو برقرار رکھا جائے۔

اس دلیل سے اگر دیکھا جائے تو تہذیب کا اولین اصول تو یہ ہونا چاہیے تھا، اور اب بھی چاہیے ہے، کہ تہذیب کی حالت شروع ہونے کے بعد، دنیا میں پیدا ہونے والے ہر شخص کی حالت اُس حالت سے بدتر نہیں ہونی چاہیے جو اُس عرصہ سے پہلے پیدا ہونے والے کی حالت ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں ہر ملک کے اندر لاکھوں کی حالت اُس حالت سے بہت بدتر ہے جب وہ تہذیب شروع ہونے سے قبل پیدا ہوتے۔

یہ بات صاف ہے کہ زمین اپنی فطری کاشت نہ کردہ حالت میں 'انسانی نسل کی مشترکہ ملکیت تھی' اور ایسا ہی رہتی۔ اُس صورت میں ہر شخص پیدائشی طور پر صاحب ملکیت ہوتا۔ وہ، اراضی اور اس کی ساری فطری پیداواروں یعنی سبزیوں اور جانوروں کی ملکیت میں دوسروں کے ساتھ تا حیات مشترک مالک ہوتا۔

'زمین، اپنی قدرتی ہل نہ چلائی ہوئی حالت میں انسانی نسل کی مشترکہ ملکیت ہے'۔ چونکہ زمین کے مالک نے اسی مشترکہ ملکیت سے زمین حاصل کرلی اس لیے اسے بنی نوعِ انسان کی بنیادی ضرورتیں اسی جائیداد سے پوری کرنا ہوں گی۔ اس نے ٹام کے بقول زمین کو بہتر بنایا، قابلِ کاشت بنایا۔ مگر زمین تو مشترکہ انسانی ہے۔ لہٰذا اُسے زمین کا کرایہ دینا ہوگا جس کو پھر پنشنوں اور معذور لوگوں کی بہبود پر خرچ کیا جائے گا۔

یہ بالکل فطری بات ہے کہ زمینی ملکیت کا تصور کاشتکاری کے ساتھ شروع ہوا، اور اُس

سے قبل زمینی جائیداد کا کوئی تصور نہ تھا۔ ملکیت کا تصور انسان کی اولین حالت یعنی شکار کی حالت میں موجود نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ انسان کی دوسری حالت یعنی چرواہے والی حالت میں بھی وجود نہیں رکھتا تھا۔ ابراہیم، اسحاق، یعقوب کے وقت (یا جب تک کہ بائبل کی تاریخ جاتی ہے) زمین کے مالک نہ تھے۔ ان کی ملکیت ریوڑ تھے جن کے ساتھ ساتھ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ اس زمانے میں عرب کے خشک علاقے میں ایک کنوئیں کا استعمال عموماً لڑائی کا باعث بنتا تھا۔ وہ بھی یہی بتاتا ہے کہ وہاں کوئی زمینی جائیداد نہ تھی۔ یہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ زمین کو ملکیت کے بطور قرار دیا جاسکتا ہے۔

شروع میں زمینی جائیداد جیسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ انسان نے زمین نہیں بنائی، اور گو کہ، اسے اس پر بسنے کا فطری حق تھا، اس کے پاس اس کے کسی حصے کے دائمی قبضہ میں 'اپنی ملکیت' کے بطور قرار دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا: نہ ہی زمین کے خالق نے کوئی زمین کا دفتر کھولا، جہاں سے اولین حقیقی دستاویزات جاری ہوتے۔ تو پھر زمینی جائیداد کا تصور کب ابھرا؟۔ میں پہلے کی طرح جواب دیتا ہوں کہ جب کاشتکاری شروع ہوئی تو اس کے ساتھ زمینی جائیداد کا تصور پیدا ہوا، خود زمین جس پر جو بہتری لائی گئی، وہ کاشتکاری سے لائی گئی۔ اب تک کی بہتری کی قدر، زمین کی قدرتی قدر سے بڑھ گئی، اُس وقت سب کا مشترک حق اُس فرد کے کاشتکاری کردہ حق میں شامل ہوگیا۔ البتہ وہ حقوق کے ممتاز انواع ہیں، اور جب تک زمین برداشت کرتی رہے گی، ایسا ہی رہے گا۔

نوجوان جنرل نپولین بوناپارٹ نے بادشاہ پرست بغاوتوں کو کچل دیا۔ اس کے بعد 1795 میں 'ڈائریکٹری' نامی ادارے نے فرانسیسی ریاست کا کنٹرول سنبھال لیا اور 1799 تک اقتدار اپنے پاس رکھا۔ نیشنل کنونشن (قومی اسمبلی) بکھر گیا۔ 4 ستمبر 1794 میں کودتا ہوا اور ہژدمی برومیئر (9 نومبر 1799) کو بوناپارٹ فرانس کا لیڈر بنا۔

نپولین بوناپارٹ فرانس پر مسلط ہوچکا تھا۔ اس نے انقلاب کے نام پر پین کو ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ وہ خود چل کر پین کے پاس گیا کہ دنیا بھر کے انقلاب میں وہ اس کا ساتھ دے۔ پین بہت خوش ہوا۔ یہاں پین اپنی زندگی کی ایک بڑی غلطی کرتا ہے۔ وہ نپولین کے ساتھ مل گیا۔ جس

طرح پاکستان میں انقلاب کی آس میں کئی لوگ جنرل ایوب سے ملے اور اب تک ہاتھ ملتے ہیں۔ بھٹو میں سے انقلاب کی برآمدگی کا تو بے شمار لوگوں کو آسرا تھا، اور پھر جیل میں پیاز اور مرچ اُن کا مقدر رہنے۔ ٹام پین تین سو برس قبل اپنے تجربے سے ہمیں سکھا گیا کہ ایسے طالع آزماؤں سے متاثر ہو کر اپنی جدوجہد اُن کے ہاتھ رہن نہیں رکھنی چاہیے۔ پین جب نپولین کے ساتھ مل گیا تو اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ وہ تو پوری دنیا میں 'انقلاب' کے نام پر اپنا اقتدار مسلط کرنا چاہتا تھا، فوجی حملوں کے ذریعے۔ وہ بالخصوص پین کی جنم بھومی برطانیہ پر حملہ کرنے میں پین کا تعاون چاہتا تھا۔ بین الاقوامیت پسند پین کسی بھی انقلاب کے بہانے دوسرے ممالک پر حملے کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ٹام پین فرانس میں نپولین کے ساتھ نہ چل سکا۔ ایک بوڑھے پین کے لیے اب ایک غیر دوستانہ فرانس میں رہنا مشکل تر ہو جا رہا تھا۔ وہاں (بلکہ اب تو ہر جگہ) اُسے مسیحیت کا دشمن گردانا جاتا تھا۔ ہر امید سے ناامید یہ انقلابی اپنے آخری ایام امریکہ میں گزارنے کا خواہش مند ہوا۔ وہیں اپنے آخری دن گزارنا چاہتا تھا، وہیں مرنا، اور وہیں دفن ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ نپولین خان کے ہاتھ نہیں کھیلا۔ کم سیالی کی بجائے گم سیالی بہتر جانی۔ 1802 میں اس نے فرانس چھوڑا اور امریکہ جا پہنچا۔

چونکہ نپولین کی پولیس آزادی سے سوچنے والوں کے لیے زندگی کو جہنم بنا رہی تھی، اس لیے پین اپنے دوست بونیولی کی بیوی اور اُن کے تین بیٹوں کو ساتھ لے کر امریکہ چلا گیا جن کی کہ وہ کفالت کرنے والا تھا۔ دلیل کا زمانہ اور دوسری تحریروں نے یہاں بھی اپنے خالق کی بربادی کا سامان کر رکھا تھا۔ اُسے یہاں بھی شیطان کا چیلا قرار دیا گیا تھا۔

وحدت کالونی کا آخری سٹاپ

اب امریکہ ٹام پین کے لیے بازو پھیلائے کھڑا نہ تھا۔ وہاں تو دکھوں کی ایک اور نوع کی ضیافت اس کی منتظر تھی۔ امریکی انقلاب میں اس کے کردار کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ اب تو وہ صرف اور صرف 'کافر' تھا۔ اور عہد کا سب سے بڑا کافر۔ وفاق پسند لوگ حکومت سے متعلق خیالات پر اس سے نفرت کرتے تھے، بورژوازی انقلابِ فرانس کے ساتھ اُس کی وابستگی کی بنا پر اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور عوام الناس جارج واشنگٹن کے نام اُس کے خط اور عقیدے کے خلاف اس کے کتابچے کی وجہ سے اس سے نفرت کر رہے تھے۔ 'ملعون ہو اُس کی شہرت...... دوام پائے اُس کی شرمندگی' وہاں مقبول ترین نعرہ بنا۔ سوشل بائیکاٹ کی حد تک یاروں نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔

یہی سبب ہے کہ تھکے ہارے پین نے جب فرانس میں امریکی سفیر سے امریکہ واپس چلے جانے کے اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا تو وہ حیران رہ گیا۔ دلیل کا زمانہ نے امریکہ میں سخت مخالفت پیدا کر دی تھی۔

اُس کا برپا کردہ انقلاب، اب انقلاب نہ تھا۔ وہ انقلاب تو پتلا ہو کر محض آزادی رہ گیا تھا۔ اور آزادی کچھ زیادہ احسان مند نہیں ہوا کرتی۔ بالخصوص ایک ایسے شخص کے لیے جس نے اپنے ساتھی اور بعد میں محض صدرِ مملکت رہ جانے والے جارج واشنگٹن کے خلاف خوب لکھا تھا۔ چنانچہ ٹام

کوامریکہ میں بدترین دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔مسیحیت دشمن کہہ کراسے گالیاں دی جاتی تھیں، دھتکارا جاتا تھا،اورایک آدھ بارتواسے ماربھی پڑی۔ یہ وطن اب وہ پرانا وطن نہ تھا۔اب پین کامن سینس نہ تھابلکہ مذہب دشمن اورشیطان کا ساتھی تھا۔ وہ عوام کی نفرت صرف محسوس نہ کررہا تھا بلکہ تبصرہ،نعروں،آوازے کسنے،حتیٰ کہ جسمانی تشدد چکھ کربھگت بھی رہا تھا۔اس کا اپنا دوست اور جدوجہد کا ساتھی جیفرسن صدر تھا۔مگر'رائے عامہ' کے خوف سے اس نے بھی پین کے بڑھاپے کوسہارا دینے کی جرأت نہ کی۔اوراُسے حالات اورعوامی مخالفت کے حوالے کردیا۔ووٹرز کوکون ناراض کرسکتا ہے!!۔

حالانکہ امریکہ پہنچ کسی روزگار کی امید میں وہ جنگِ آزادی کے اپنے رفیق جیفرسن سے ملا جوواشنگٹن کے بعداب منتخب کردہ امریکہ کا صدر تھا۔

صدرتو بہرحال صدر ہوتا ہے۔اورصدر سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔بس،ایک آدھ ماضی کی باتیں، کچھ یادیں،ایک آدھ کھانا......اُس کے بعدصدرصدر رہتا ہےاورٹام پین،ٹام پین۔ ایک محل میں دوسرا محلے میں۔محل میں ایک آدھ کمرہ،خواہ سرونٹ کوارٹر ہی ہوتا،اُسے نصیب نہ ہوا۔سارا امریکہ ٹام کے خلاف تھا،لہٰذاجیفرسن خلافِ مصلحت کیسے جاتا۔نہ اُس بڈھے بےوارث کو کوئی نوکری دی،نہ کوئی وظیفہ مقررکیا۔ایک سماج،ریاست اورحکومت نے ایک بوڑھے غریب کواس کی قسمت کے حوالے ہی رہنے دیا۔(کتنی قابلِ نفرت ہے وہ ریاست جواپنے کمزورشہریوں کوقسمت کے حوالے چھوڑ دیتی ہے)۔

'وحدت کالونی' کوئٹہ میں ایک بہت بڑی آبادی ہے۔لوکل بس پہ بیٹھیے تو کنڈکٹر آوازیں لگائے گا:'پہلا سٹاپ، پہلا سٹاپ'۔اُس کے بعداس کی صدائیں آئیں گی'دوسرا سٹاپ، اترو دوسرا سٹاپ والا'......اور پھراُس کا نعرہ ہوگا:'آخری سٹاپ، اترو وحدت کالونی آخری سٹاپ،آخری سٹاپ'۔

انسانی حیات کا بھی تو ایک آخری سٹاپ ہوتا ہے۔اُس آخری سٹاپ کولازماً آنا ہے۔اور بہت اچھا ہوگا اگر یہ آخری سٹاپ اپنے وقت پرآجائے۔جس کے لیے ہمارے بزرگ دعائیں

کرتے رہتے ہیں:''ہمیں آخری دنوں میں کسی کی محتاجی نہ ہو''۔

مگر یہاں موت بھی مختلف تھی۔انقلاب کے ناقابلِ علاج عاشق،تھامس پین نے زندگی کی مشہوروافسانوی حدتو گزاری دی۔اس کے دوست اورواقف کارایک ایک کرکے ساتھ چھوڑتے گئے۔وہ ہرطرف سے تہمت بازی کا شکار ہوا،اس سے نظریں بچابچا کردور رہا گیا،اس سے شدید نفرت کی گئی،کراہت کی حدتک نفرت ....اس کی خوبیوں کوگناہ کے بطورملعون کیا گیا...... اس کی خدمات بھلادی گئیں..........اس کا کردار سیاہ کردیا گیا۔

مگراس حبیب جالبؔ نے آخرتک اپنی روح کا توازن برقرار رکھا۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں،ناروائیوں کامسلسل نشانہ رہا،مگراس کا مضبوط ایمان مضبوط ہی رہا۔وہ ابھی تک آزادی کا ایک سپاہی تھااورابھی تک اُن لوگوں کوروشن فکراورمہذب کرنے کی کوشش کررہا تھاجوبےصبری سے اُس کی موت کا انتظار کررہے تھے۔حتیٰ کہ انہیں بھی جواپنے دشمنوں سے تومحبت کرتے تھے،مگراُس سےنفرت کرتے تھے۔

آٹھ جون1809 کوگالیوں،نفرتوں،نظراندازیوں،غربت اور بیماری کے مارے 73 سالہ انقلابی پرموت کورحم آہی گیا..........موت،جوتقریباً اُس کی واحد دوست رہ گئی تھی،اُس سے ملنے آہی گئی۔ایسی صورت میں کہ نہ اشک بہاتی بیوی ساتھ تھی،نہ کوئی بیٹا بھائی موجود تھا جواس کے کفن دفن کے انتظامات میں مصروف ہو۔نہ کوئی پرانا یار بیلی موجود تھا جوساتھ گزارے تلخ وشیریں ساعتوں کے طفیل ایک دوستانہ نگاہ اسے عطا کرتا۔نہ کوئی عزیز رشتہ داریا محلے والے تھے جن کی کھسر پھسروں کی الوداعی انسانی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتیں..........حتمی طور پرایک بےوارث موت،ہرطرح سے تکمیل یافتہ لاوارثی کی موت۔ایک ایسے شخص کی موت جودنیا بھر کے مظلوموں،مقہوروں اورضعیفوں ناتوانوں کا وارث رہا تھا۔

عالمی انقلاب کے اس'مشنری' کی تدفین پہ بھی کوئی نمائش نہ تھی،کوئی شان وشوکت نہ تھی،شہریوں کا کوئی جلوس نہ تھا،کوئی فوجی نمائش نہ تھی۔ایک لولاکی شہرت رکھنے والا ہیروآج گم نامی کی آخری تہہ میں سے زمین کی تہہ میں دفن ہونے لے جایا جارہا تھا۔ایک بگھی میں،بونیولی کی بیوی

اپنے بیٹے کے ساتھ جو اُس مردہ کی سخاوت پہ زندہ تھے، گھوڑے پر سوار ایک کوئیکر، جس کی انسانیت اُس کے عقیدے پر حاوی تھی۔ اور پیچھے پیچھے احسان مندی سے بھرے دو پیدل نیگرو............تھامس پین کی تدفین کا جلوس اِن اشخاص پر مشتمل تھا۔ تمام عمر مذہب کے حق میں جدوجہد کرنے والا، پنڈت و پادری کی طرف سے جنازہ خوانی سے محروم تھا۔ اس پہ کفر کا تاثر پورے علاقے میں پھیلایا گیا تھا۔ اس کی میت کو کسی مسیحی چرچ نے قبول نہ کیا۔ کوئی بھی قبرستان اس کی ابلیسیت کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ اس لیے اُسے اُس کے اپنے فارم میں ایک اخروٹ کے درخت کے نیچے داب دیا گیا۔

مگر جیسا کہ اکثر بڑے انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، دس برس بعد ولیم کوبٹ نامی ایک صحافی نے اس کی میت نکالی اور اسے انگلینڈ میں دفن کرنے لے گیا۔ مگر برطانوی حکومت نے اسے ایسا کرنے نہ دیا۔ اس کی ہڈیاں کھوگئیں اور ٹام پین بغیر قبر کے ہزاروں نیک دلوں میں موجود ہے۔ (اور دلوں میں دفن ہونا بے جان زمین میں گاڑے جانے سے لاکھ درجہ بہتر ہوتا ہے!!)۔

البتہ، پیرس میں اُس گلی پہ جہاں وہ 1797 سے لے کر 1802 تک رہا تھا، ایک کتبہ لگا ہے:

”تھامس پین، برطانوی..........پیدائش کی وجہ سے
امریکی..........اپنائے جانے کی بنا پر
فرانسیسی..........فرمان سے“۔

****

لیکن ذرا سوچیے......

پین کے بعد آنے والے تین سو برس میں دنیا میں کتنے تھامس پین پیدا ہوئے۔ اور کس طرح مخالفین کے ہاتھوں دردناک عبرت سے دوچار ہوئے۔ لاطینی امریکہ، افغانستان، ایران اور ہمارا اپنا وطن جہاں بے شمار مسخ کردہ سیاسی ورکرز کی لاشیں اس جنگ کے تاقیامت جاری رہنے کی محض چند مثالیں ہیں۔ پین بھی نام بدل بدل کر آتا رہے گا اور اس کے مخالفین بھی بہانے بدل بدل

کراس کے ٹکڑے کرتے رہیں گے............ بس نام رہ جاتے ہیں۔ نام، جنہیں انسان کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ وہ لوگ جو انسان کی آزادی کے لیے لڑے، اُن کے نام صدیوں بعد بھی انسان اپنے بیٹوں، پوتوں پر رکھتا رہے گا۔ اس لیے کہ صرف انسان جانتا ہے کہ کس کو حقارت سے فراموش کیا جانا ہے اور کس کی نیک نامی لافانی رکھنی ہے۔